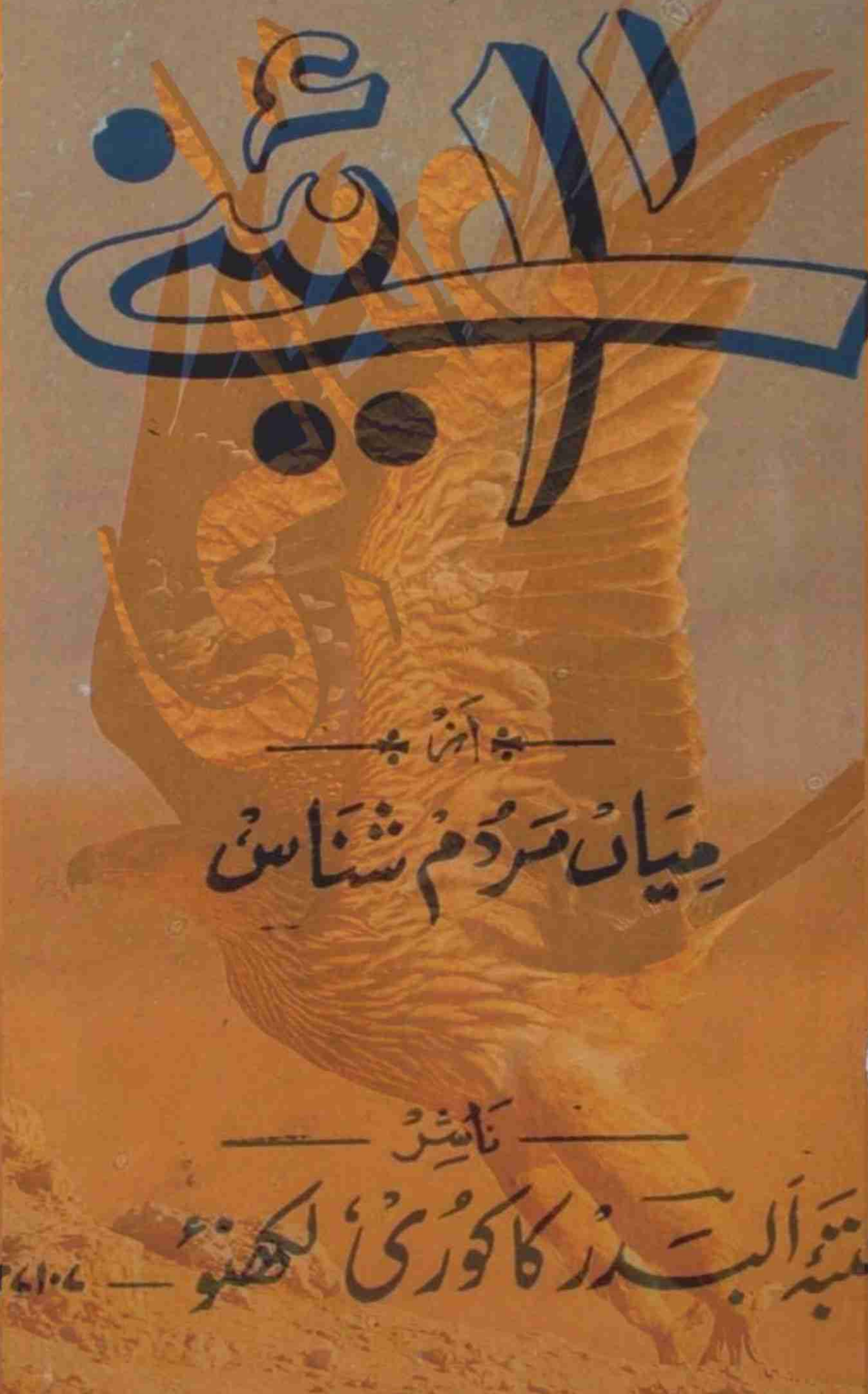


لایعنی

از

میاں مردم شناس

ناشر

مکتبۂ البدر کاکوری لکھنؤ — ۲۲۶۱۰۷

مذہب، سماج اور سیاست کے رستے ہوئے ناسوروں کی
نشاندہی مقصدی طنز و مزاح پر ایک کامیاب کتاب

آئینہ

از

میاں مردم شناس

ناشر
مکتبہ البدر کاکوری لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷

پہلی بار ——— ایک ہزار
نام کتاب ——— آئینے
نام مصنف ——— میاں مردم شناس
کتابت ——— شبیر احمد قاسمی
طباعت ——— نشاط پریس ٹانڈہ
صفحات ——— ۲۰۸
قیمت ——— دس روپے

ناشر

مکتبہ البدر کاکوری لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷ انڈیا

ایمن آباد کے رواں دواں چوراہے پر

بس اتنا ہونا کافی تھا۔

بیچ بچاؤ کرنے والوں، تحقیق حال کرنے والوں، محض دل
چسپی لینے والوں، سب ہی طرح کے لوگوں کا مجمع اکٹھا ہونے
لگا، اور تھوڑی ہی دیر میں اس حادثہ میں ملوث تینوں حضرات
ایک بڑے مجمع کے بیچ گھرے کھڑے ہوئے تھے، اور ساتھ ہی
تینوں سے کیا؟ کیوں؟ اور کس طرح؟ کے ذریعہ سوالات
کئے جارہے تھے..........

پھر کیا ہوا؟

اسی کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔

ایڈیٹر صاحب بولے،

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھٹو کو بے قصور سمجھتے ہو؟ اور تمہارے خیال میں بھٹو کو پھانسی پر لٹکا کر ان پر ظلم کیا گیا؟

میں نے کہا، اجی حضرت! یہ بات نہیں ہے، آپ کی ایک بات میں کہتا ہوں، دوسری نہیں۔

یعنی میرا یہ خیال تو ہے کہ بھٹو کو پھانسی دیکر ظلم کیا گیا مگر وہ اس لئے نہیں کہ بھٹو بے گناہ تھے اور ان کو کسی بھی حال میں پھانسی کی سزا مل ہی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ ......؟؟؟

یہ ہے

بھٹو کا مسئلہ

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

مکتبہ البدر کے قیام کے وقت یہ پروگرام بنا تھا کہ سہ ماہی وقفۂ اشاعت کے ساتھ مسلسل کتابیں شائع کی جائیں گی۔

چنانچہ پہلی کتاب مولانا عبد العلی صاحب فاروقی ایڈیٹر البدر کی تصنیف "عورت اور پردہ"، اور پھر دوسری کتاب مولانا جمیل احمد صاحب نذیری کی تصنیف "فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان"، مکتبہ کی طرف سے شائع کی گئیں،

اگرچہ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے دوران بھی وقفہ ۳ ماہ سے زائد کا تھا۔ مگر دوسری کتاب کی اشاعت کے بعد گوناگوں حالات سے مجبور ہو کر طویل عرصہ کے لیے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت کئی کتابیں منتظر اشاعت تھیں ہی، نیز پہلی دونوں کتابوں کے ایڈیشن بھی ختم کے قریب پہونچ چکے اور انکے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت ہے،

طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے ہم حلقۂ البدر کی جانی پہچانی شخصیت میاں مردم شناس کی دھماکہ خیز کتاب "آئینے" پیش کر رہے ہیں۔

میاں مردم شناس صاحب کا تعارف میں کیا کراؤنگا جبکہ وہ خود اپنا تعارف نہ کرا سکے، البتہ انکے مضامین کے تعارف کے سلسلہ میں صرف ایک جملہ کافی ہوگا کہ "دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھنے کی کامیاب کوشش ہے"۔

آپ ان مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ میاں مردم شناس کے مضامین اور انکی کتابوں کی اشاعت بڑے پیمانے پر اور مسلسل ہونا چاہیئے، مگر آپ کو اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ میاں مردم شناس صاحب کے مضامین یا کتابوں کی اشاعت کچھ آسان کام نہیں ہے۔

میاں مردم شناس صاحب کا تو دعویٰ ہے کہ میری کتاب ہاتھوں ہاتھ لیجائیگی، اور ایڈیشن پر ایڈیشن ہونگے، اب دیکھنا ہیکہ آپ کیطرف سے انکے اس دعویٰ کا کیا جواب ملتا ہے؟ اگر واقعی میاں مردم شناس صاحب کے دعویٰ کے مطابق آپنے ان کے مضامین کو پسند کیا تو "آئینے" کے دوسرے حصہ کیلئے بھی میاں مردم شناس صاحب کی خوشامد کی جائیگی، اور انھیں ہر قیمت پر راضی کیا جائے گا ——— اس کتاب کی اشاعت کے بعد جلد ہی انشاء اللہ تعالیٰ مولانا عبد العلی صاحب فاروقی کی ایک اہم اور وقیع کتاب پیش کیجائیگی جسکی کتابت کا کام شروع ہو چکا ہے، اشاعت کی قطعی تاریخ کا اعلان ابھی مشکل ہے مگر ہماری دلی خواہش ہیکہ ہم اپنے اعلان کردہ پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں، دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ دشواریوں کو دور فرما کر ہمکو خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں

——— والسلام :- منیجر مکتبۃ البدر، کاکوری، لکھنؤ، ۲۲٫۶٫۸۱ء ———

میری سرگذشت یا مقدمہ

قارئین! میں اپنے مضامین اور آپکے درمیان مخل ہوکر زیادہ دیر تک آپکو انتظار کی زحمت میں نہیں ڈالے رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپنے کتاب غالباً اپنے قریب کی کسی لائبریری سے یا پھر کسی "بدذوق" سے مطالعہ کے لیۓ عارضی طور پر حاصل کی ہوگی (یہ بات میں آپ کی عقل پر اعتماد کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں، کیونکہ عام طور پر ہر "عقلمند" آدمی کتابیں خرید کر پڑھنے کے سلسلہ میں بہت محتاط ہوتا ہے) اور ظاہر ہے کہ آپنے کتاب اس کے مضامین کے مطالعہ کیلیۓ حاصل کی ہوگی، میری "سرگذشت" سننے کیلیۓ نہیں۔

مگر برا ہو اس رواج کا کہ ہر کتاب کے شروع میں ایک عدد مقدمہ یا دیباچہ وغیرہ ضرور لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر آف "دا بدر" منتقلی نے مجھ سے فرمائش کی کہ تمہاری کتاب چھپنے جا رہی ہے لہذا ایک عدد مقدمہ بھی لکھدو۔ میں نے پوری سنجیدگی اور دیانتداری کیساتھ کہا کہ مجھے کتاب کی اشاعت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے میں مقدمہ لکھنے سے معذور ہوں۔

ایڈیٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا، تم تو ہر وقت بہکی بہکی باتیں کرتے

رہتے ہو، بھلا سوچو تو سہی! تمہارے لئے یہ کس قدر مسرت کا موقع ہے کہ تمہارے مضامین کا پہلا مجموعہ منظرِ عام پر آ رہا ہے، اور تمہارا تعارف ایک باقاعدہ ادیب کی حیثیت سے ہونے جا رہا ہے۔

میں نے کہا اس سے میرا کیا فائدہ ہوگا؟

ایڈیٹر صاحب نے حسبِ عادت میری عقل پر حملہ کرتے ہوئے کہا، ارے ناسمجھ! یہ کیا کوئی کم بات ہوگی کہ لوگ تمہیں ادیب کہیں گے۔ اور اردو ادب میں تمہارا نام بھی شامل ہو جائے گا؟

میں نے کہا اہلیہ نے آج ہی الٹی میٹم دیا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر دو جوڑے کپڑے انکے ۲ کرتے ۲ پاجامے میرے اور کم از کم ۴ جوڑ جھوٹے بچوں کے تیار ہونا ہیں ورنہ...... ورنہ نتائج بھگتنے کیلئے تیار رہیئے اب آپ یہ بتایئے کہ ادیب ہو جانے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائیگا؟

ایڈیٹر صاحب نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھ کو بلیک میل کرنا چاہتے ہو کہ اگر میں تمہارے گھر بھر کے کپڑے بنوانے اور پھر دوسری ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کروں تو تم مقدمہ لکھو گے ورنہ نہیں۔

میں نے کہا معاف کیجیے گا، کتاب کے معاملہ کا آپ سے کچھ تعلق نہ تھا یہ تو منیجر مکتبہ البدر، اور میرے درمیان کی بات تھی مگر آپکو تو ہر معاملہ میں ٹانگ اڑانے اور مجھے نقصان پہونچانے کا شوق ہے، اس لئے یہ معاملہ بھی آپنے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بہر حال اب اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیئے! مکتبہ البدر اس کتاب کے ذریعہ رقم کمائے گا اس کتاب سے جو نفع حاصل ہوگا، وہ "مکتبہ البدر" کو ملے گا، مجھے نہیں اس لئے اگر اپنے مضامین کی اشاعت پر میں مکتبہ سے "رائلٹی" طلب کر دں تو کونسی قانونی یا شرعی رکاوٹ ہے؟

اتنا سنتے ہی اڈیٹر صاحب چراغ پا ہوتے ہوئے بولے، جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں، ان کی باقاعدہ اجرت تم کو مل چکی ہے۔

میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، معاف کیجئے گا، یہ معاملت کی بات ہے وہ مضامین "البدر" کے لئے لکھے گئے تھے "کتاب" کیلئے نہیں، کتاب چھاپنے کے لئے آپکو قانونی طور پر اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔

اڈیٹر صاحب کو بھلا اس کی کہاں برداشت کہ میاں مردم شناس جیسا معمولی آدمی انکے منہ لگے، چنانچہ انھوں نے بڑے ہی غصیلے لہجہ میں کہا، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ مضامین اب "ادارہ البدر" کی ملکیت ہو چکے اور ادارہ کو انھیں ہر طرح شائع کرنے کا حق حاصل ہے، اس پر قانونی و شرعی اعتبار سے تم کو کسی قسم کے اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے، بہتر ہو کہ اپنے بھیجے پر جمے گرد و غبار کو صاف کر لو، اور شرافت کے ساتھ مقدمہ لکھ دو تاکہ تم کو بھی کچھ فائدہ ہو جائے۔

میں نے اپنی قانونی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے مضامین کے بجائے مقدمہ پر تان توڑتے ہوئے کڑک دار آواز میں کہا، تو پھر ٹھیک ہے آپنے میرے مضامین کی اجرت دی ہے، میرے قلم کی اجرت نہیں دی ہے لہذا جو مضامین

آپکے پاس ہیں آپ انھیں چھاپ لیجئے میں مقدمہ ہرگز نہ لکھونگا، کیونکہ آپ نے اس کی اجرت نہیں دی ہے۔

ایڈیٹر صاحب ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے اور میں بھی نہایت ہی فاتحانہ انداز میں گھر واپس آگیا۔ اور اہلیہ کو بلا تمہید خوشخبری سنائی کہ کپڑوں کا انتظام ہوگیا ہے۔

اہلیہ کے لبوں پر لمحہ بھر کیلئے مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور پھر فوراً ہی برسات کی دھوپ کی طرح غائب ہوگئی، اور انھوں نے بڑے ڈکٹیٹرانہ انداز میں دریافت کیا کہ ایڈیٹر صاحب سے قرض وغیرہ تو نہیں لے لیا۔؟

میں نے کہا کہ نہیں نیک بخت نہیں قرض وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔

اہلیہ بولیں پھر بتائیے تو سہی کہ یہ ایکدم سے کیسے انتظام ہوگیا؟

میں نے کہا، بیگم! تم میری صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو یا واقف ہونے کے باوجود انکا اقرار مناسب نہیں سمجھتی ہو، بات دراصل یوں ہے کہ ایڈیٹر صاحب کی ایماء سے مکتبہ البدر کی طرف سے میرے مضامین کا مجموعہ "آئینے" شائع ہو رہا ہے جس کے شروع میں ایک عدد مقدمہ لکھا جانا از حد ضروری ہے جو خان بہادر میاں مردم شناس کے سوا کوئی بھی نہیں لکھ سکتا، اور اس مقدمہ کے لئے بطور معاوضہ میں نے یہ شرط رکھی ہے کہ کپڑوں کا انتظام کیا جائے، بصورت دیگر میاں مردم شناس کے مقدمہ سے محروم رہنا گوارہ کیا جائے، اور اب ایڈیٹر صاحب جھک مار کر مجھے کپڑے بنوانے کیلئے رقم دینے پر مجبور ہوں گے۔

اہلیہ نے بڑی تشویش کے ساتھ کہا، کیا آپ نے ایڈیٹر صاحب سے کہدیا کہ بغیر معاوضہ کے مقدمہ نہیں لکھیں گے؟

میں نے مسکراتے ہوئے کہا، بیشک!

اہلیہ نے تفکرات کی دنیا میں غوطہ لگاتے ہوئے کہا، کتاب تو بغیر مقدمہ کے بھی چھپ جائیگی، لیکن اگر آپ کو ادارۂ البدر، سے چلتا کر دیا گیا تو؟

تو، میں نے کہا، تو پھر یہ ہوگا کہ کتاب ایسی لگے گی، جیسے بے کفن کی لاش اور البدر کو بند ہونے میں تین ماہ سے زیادہ وقت نہ لگے گا۔!

پاک پروردگار کی قسم اگر بغیر میرے مقدمہ کے کتاب چھاپ دی گئی تو ایڈیٹر البدر اینڈ کمپنی کو چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا، کتابیں دیمک کی نذر ہو جائیں گی، کوئی خریدار نہ ملے گا، عدالت کی طرف معاوضہ مع ہرجہ خرچہ کی ڈگری نہ حاصل کرلوں تو تمہارا شوہر نامدار نہیں!

اہلیہ نے میری اس زوردار پھٹکار کے جواب میں اپنا سر پکڑ لیا اور ابھی وہ لعن طعن اور ملامت وسماجت کرنیکی تیاری ہی کر رہی تھیں کہ دروازہ کی کنڈی بجی، جس کے جواب میں میں دروازہ کی طرف لپکا، اور نہ جانے کتنے جوش آور اور رقت آمیز الفاظ نے اہلیہ کے دل و دماغ میں دم توڑ دیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے منیجر صاحب مکتبہ البدر کو مسکراتا پایا۔

علیک سلیک کے بعد منیجر صاحب نے بلا تمہید کہا، ارے بھئی آپ بھائی صاحب سے کیوں بگڑ گئے، یہ تو میری آپکی معاملت کی بات تھی، ان سے کچھ کہنے

کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے کہا، آپ ہی معاملت طے کر لیجئے، بتائیے کہ کتاب کے سلسلہ میں مجھے کیا ملے گا؟۔

منیجر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا کہ چلیئے یہ سب باتیں چل کر دفتر ہی میں طے کریں گے، اور اب آپ خدا کے واسطے غصہ تھوک دیجئے۔

ہم دونوں جس وقت دفتر البدر پہونچے تو اڈیٹر صاحب کو پہلے سے موجود پایا، حالات سے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ فضا اب اس قدر مخالف نہیں ہے جتنی پہلے تھی جس سے یقین ہو گیا کہ میرے موضوع پر ان حضرات کے درمیان پہلے گفتگو ہو چکی ہے، جس میں یہ طے پا چکا ہے کہ مجھے راضی کرنا بہت ہی ضروری ہے اس تصور نے مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے شاباشی دینے کیلئے اپنی پیٹھ خود ہی ٹھونک لی۔

قبل اس کے کہ میں اس سلسلہ میں کوئی گفتگو کروں منیجر صاحب نے اڈیٹر صاحب کے دربار میں مجھے پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں ان کو لے آیا ہوں، یہ مقدمہ لکھیں گے، اب آپ یہ طے کر دیجئے کہ اس کتاب کے سلسلہ میں میرے اور انکے درمیان کیا معاملت ہو گی۔

میں کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ اڈیٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے گویا حکم دیا کہ تم ابھی تھوڑی دیر اپنی چونچ نہ کھولو میں تمہاری بات کو سمجھ چکا ہوں اور اس کی رعایت کے ساتھ ہی کچھ معاملت ہو گی،،

اور پھر خود ہی اپنا نادر شاہی حکم جاری کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے،

دیکھو بھائی تم کو کتاب کا مقدمہ لکھنا ہوگا کیونکہ کتاب تمہاری ہے مقدمہ کوئی اور کیسے لکھ سکتا ہے (میں زیر لب بڑبڑایا کہ،، جیسے کوئی لکھ سکتا ہے اور نہیں لکھ رہا ہے، سبحان اللہ!) البتہ یہ ہے کہ کتاب کے نفع میں سے تم کو بھی ملنا چاہیئے، لہذا طے یہ ہوا ہے کہ تم کو مبلغ پانچ سو روپے نقد ملیں گے، مگر اس وقت جب کتاب کے پانچسو نسخے فروخت ہو جائیں،

قارئین۔ اب یقین کریں کہ یہ کوئی ماننے والی شرط نہ تھی، اور میرے بھی جی میں بہت آیا کہ ایک مرتبہ پھر جنگ کا بگل بجا دوں اور کہدوں کہ نہیں لکھونگا مقدمہ جو بنا سکتے ہوں بنا لیجئے، مگر آہ! مجھے معلوم ہے کہ میری اہلیہ چیخ چیخ کر اور رو رو کر میری جان کو آجائے گی اس لئے مجبوراً اس شرط کو منظور کر کے مقدمہ لکھدیا ہے حالانکہ مجھے یقین ہے کہ وہ نوبت ہی نہ آئیگی کہ کتاب کے پانچسو نسخے بکنے کی مجھے اطلاع ملے اور میں اپنی رقم کا مطالبہ کروں، جبکہ مکتبہ البدر کے ایک ذمہ دار رکن نے (جس کا نام ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف ہے) مجھے اطلاع دی ہے کہ ماہ جون ۱۹۸۱ء کے شمارہ میں،، آئینہ،، کے ذریعہ کتاب کی اشاعت کی خبر ہوتے ہی تین سو نسخوں کا آرڈر بک ہو چکا ہے، اگر یہی رفتار رہی تو ایک ہزار کا ایڈیشن ختم ہوتے کیا وقت لگے گا۔؟

اے خدا تو ایڈیٹر البدر اور منیجر مکتبہ البدر کو توفیق عطا فرما کہ وہ ایمان

داری کے ساتھ جلد ہی مجھے میری رقم ادا کر دیں، کتابیں تو خیر بک ہی جائیں گی۔

پریشاں حال

میاں مردم شناس

ل ک ہ ن ؤ ۔ دد، دو، چھ، زیرو، زیرو، تین، انڈیا

ہپی ازم

ٹرکوں کے حادثات میں روز افزوں اضافہ۔ شہری انتظامیہ کے لئے پریشان کن مسئلہ۔ ——————— ایک خبر

اس خبر کو پڑھ کر یقیناً آپ نے یہی سمجھا ہوگا کہ کچھ بد احتیاط ٹرک ڈرائیوروں نے نشے میں دھت ہوکر راہ گیروں پر ٹرک چڑھا دیئے ہونگے، کچھ بسوں، کاروں اور اسکوٹروں کے تیز رفتار ڈرائیوروں نے رکشوں اور سائیکلوں کو ٹکر مار کر ان کی سواریوں کو زخمی کردیا ہوگا۔ ان تصادموں کے نتیجے میں بجلی کے کچھ کھمبوں کو نقصان پہونچا ہوگا، ٹیلیفون کے کچھ تار بھی شاید ٹوٹ گئے ہوں، اور بس!!

اس قسم کی خبریں آج کل اس کثرت سے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا اس کا عادی بن جاتا ہے۔ اور کوئی خاص دھیان بھی نہیں دیتا،

لیکن آج کل سڑکوں کے حادثات میں ایک بالکل نئی قسم کا اضافہ ہوا ہے عجیب و غریب اضافہ، جو واقعی شہری انتظامیہ کے لئے نہایت ہی سنگین اور پریشان کن مسئلہ ہے۔ جہاں تک سواریوں کی آمد و رفت میں عدم احتیاط کی وجہ سے ہونے والے حادثات کا تعلق ہے اس سے بچاؤ کے لئے بہت سی ترکیبیں ہیں جن پر عمل درآمد کی صورت میں اس قسم کے حادثات سے پوری طرح بچا جا سکتا ہے، مثلاً ون وے ٹرافک، اس قسم کے حادثات کو روکنے میں بہت ہی کارآمد چیز ہے، اور جہاں جہاں اس پر پوری

طرح عمل درآمد ہو رہا ہے، وہاں یا تو حادثات ہوتے ہی نہیں ہیں، یا ہوتے بھی ہیں تو بہت کم اور معمولی نوعیت کے۔ لیکن اس نئی قسم کے حادثات یا تصادموں کیلئے اب تک کوئی علاج تجویز نہیں ہو سکا ہے۔ حادثات کی یہ وہ قسم ہے جو بڑھتی ہوئی وبا کی صورت میں عام ہونے کے باوجود عام لوگوں کی نظر میں صرف ایک تفریح ہی کی حقیقت رکھتی ہے۔ اور اخبار والے بھی "مصلحتوں" کے پیش نظر ان حادثات کی خبروں کے شائع کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ یا اگر کبھی کبھار کوئی خبر شائع بھی ہو جاتی ہے تو غیر اہم طریقے پر۔ مگر ان تمام باتوں سے ان حادثات کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور مسئلہ جوں کا توں سوالیہ نشان بنا سامنے کھڑا رہتا ہے، ہو سکتا ہے آپ کو "خوش قسمتی" سے اس قسم کے کسی حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو۔ لیکن ایسا بھی شاید ہی ہوا ہو کہ آپ کی نظروں نے اس قسم کے کسی حادثہ کا مشاہدہ بھی نہ کیا ہو۔

میرے ایک دوست نے اسی قسم کے ایک حادثہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں چوک بازار اپنی ضرورت کا ایک سامان خریدنے گیا، اپنی مطلوبہ دوکان کے قریب پہونچ کر میں واپس پلٹ پڑا، اور خاموشی سے ایک دوسرے ملاقاتی کی دوکان پر جا کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی دوکان پر گیا، دوکاندار سے چونکہ پرانی یاد اللہ تھی اس لئے انھوں نے مسکراتے بلکہ قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا، کیوں صاحب آپ پہلے آتے آتے کہاں پلٹ گئے تھے، میں نے سادگی سے جواب دیا، بات یہ ہے کہ آپ کی دوکان میں گنجائش کم ہے، اور اس وقت "کوئی صاحبہ" آپ کی دوکان کے داخلی دروازہ پر کھڑی ہوئی آپ سے کچھ گفتگو کر رہی تھیں۔ اس لئے اس وقت میں نے ان کو ہٹا کر اندر آنا مناسب نہ سمجھا، اور یہ خیال کر کے واپس لوٹ گیا کہ تھوڑی دیر کے بعد

پھر آجاؤنگا،

میرے واپس جانے کے سبب بیان کرنے کے دوران تو دوکاندار صاحب زیرلب مسکراتے رہے، لیکن میری بات ختم ہوتے ہی انھوں نے اس زور د شور کے ساتھ قہقہہ بلند کیا کہ دوکان کا کاونٹر اور شوکیس ہلنے لگے، اس سلسلہ میں دوکان میں بیٹھے دوسرے لوگوں نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا، اِدھر ساری محفل قہقہہ زار ہو رہی تھی اور اُدھر میں پھٹی پھٹی نظروں سے چور بنا ہوا سب کو دیکھ رہا تھا، اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ ؏

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

آخر کچھ دیر کے بعد دوکاندار صاحب کو سنبھالا ہوا، اور اپنی انگلیوں کو اپنی داڑھی کے بالوں میں الجھاتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے، جناب وہ کوئی صاحبہ نہیں فلاں "مولانا صاحب" کے صاحبزادے .... صاحب تھے، اتنا کہتے ہی ان پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اور میں اپنے دل ہی دل میں اس بات کا یقین نہ کرتے ہوئے حیرت و استعجاب کا مجسمہ بن کر ان سے مخاطب ہوا، ارے جناب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ شانوں تک بالوں والا، وہ سبز زمین پر سرخ سرخ بڑے بوٹوں والے کپڑے کے شرٹ والا، اور وہ عنابی رنگ کے چھپے ہوئے ڈھیلے ڈھالے بیل باٹم والا، فلاں صاحب کا لڑکا تھا یا کوئی لڑکی؟ کہیں آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ انھوں نے اپنی بات پر اصرار کے طور پر ہنسی کو قہقہہ میں تبدیل کر دیا، ابھی یہ ماحول برقرار ہی تھا کہ اچانک دوکاندار صاحب نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے کہا، لیجیے تصدیق ہوئی جاتی ہے، اب جو میں نے نظر اٹھا کر سڑک کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا

وہی بانکل وہی، وہی منقش لباس، وہی دراز زلفیں، اس پر طرہ یہ کہ چال میں البیلا پن، چہرہ سے شان استغنا عیاں۔ آئے قریب آئے اور گذرتے ہوئے چلے گئے، ہاں اب میں چلے گئے کہنے پر مجبور ہوں، کیونکہ اب مجھے دوکاندار صاحب کی سچائی کا پورا یقین ہو چکا ہے اور اپنی ناسمجھی کو تو کیا کہوں۔

میرے دوست نے اپنی یہ سرگذشت سنانے کے بعد بہت دیر تک اس سلسلہ میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا، اور آخر میں ہم لوگ اس فیصلے پر پہنچے کہ ان "شاہزادے" کو "ہپی" اور اس طرح اوٹ پٹانگ کپڑے پہننے اور تمام "امتیازات" ختم کرنے کو "ہپی ازم" کہتے ہیں، یہ تو خیر ایسا حادثہ ہے جسے میں اور میرے دوست چاہے کتنا ہی اہم سمجھیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ آپ بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ ممکن ہے کہ آپ اسے محض "فریب نظر" کہہ کر ٹال دیں۔ مگر دنیائے "ہپی ازم" کا وہ عظیم الشان حادثہ تو مجھے بھلائے نہیں بھولتا، جسے دیکھنے کو ایک خلقت امنڈ پڑی تھی، اور امین آباد کی بھری پری سڑک جام ہو کر رہ گئی تھی، اگر پولیس کی بروقت مداخلت نہ ہوتی، تو نہ جانے کتنی دیر ٹرافک جام رہتی۔ اور کیا ہوا، کیا ہوا کی آوازیں بلند کرتے ہوئے جائے حادثہ کی طرف آنے والوں کا تانتا کتنی دیر میں ٹوٹتا؟ یہ وہ حادثہ ہے جسے میں اپنی زندگی کے حسرتناک حادثوں میں سے ایک شمار کرنے پر مجبور ہوں، اور آپ بھی (معاف کیجئے) اسے محض فریب نظر کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔

میں نے دیکھا کہ ایک "شریف" سا لڑکا سن کوئی ۲۲ سال ذرا تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا آرہا ہے، اور عین چوراہے پر پہنچ کر اس نے پیچھے سے "کہاں" کہتے ہوئے ایک شخصیت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ (شخصیت اس وجہ سے کہ شخصیت ناشناسی

ہی اسس حادثہ کا سبب بنی) اس شخصیت نے (جو کہ تیز نیلے رنگ کا بیل باٹم اور بڑے بڑے کئی رنگوں کے پھول پتیوں کے کپڑے والا شرٹ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ بال حسب معمول ،، کاندھوں کو چھو رہے تھے، اور اونچی ایڑی کی چپل اس کے پیروں میں تھی) پلٹ کر بڑی تیز آواز میں کہا۔ تم کون ہو؟ اور یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی وہ ،، شریف سا ،، لڑکا کچھ عذر و معذرت بھی نہ کر سکا تھا کہ اس کے گالوں پر تڑاخ تڑاخ دو تھپڑ پڑ گئے، یہ تواضع اس شخصیت کے ساتھ والے کی طرف سے کی گئی تھی جو اس سے کچھ ہی فاصلہ پر آگے آگے چل رہا تھا۔ اور بعد کے حالات سے کچھ ایسا احساس ہوا تھا کہ شاید وہ اس شخصیت کا بھائی تھا۔

امین آباد کے رواں دواں چوراہے پر بس اتنا ہونا کافی تھا، بیچ بچاؤ کرنے والوں، تحقیق حال کرنے والوں، محض دلچسپی لینے والوں، سب ہی طرح کے لوگوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اسس حادثہ میں ملوث تینوں حضرات ایک بڑے مجمع کے بیچ گھرے ہوئے تھے اور ساتھ ہی تینوں سے کیا؟ کیوں؟ اور کس طرح؟ کے ذریعہ سوالات کئے جا رہے تھے۔ ردعمل کے طور پر اکثریت کا یہی فیصلہ تھا کہ وہ ،، شریف سا ،، لڑکا مجرم ہے اس کو بغیر کسی ظاہری امتیاز کے بھی سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ وہ ایک لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے، کسی لڑکے کی طرف نہیں۔ جبکہ وہ ،، شریف سا ،، لڑکا اپنی صفائی میں اسس بیان کو بار بار دہرا رہا تھا کہ میرے ایک دوست کے لباس، وضع قطع حتیٰ کہ چال ڈھال میں حیرت انگیز طور پر مشابہت ہے، پیچھے سے اسس ،، جنسی فرق ،، کو نہ محسوس کر سکا، اس لئے یہ حادثہ وقوع میں آیا۔ لہذا میں نے دانستہ طور پر کوئی جرم نہیں کیا ہے، اپنے اس بیان کو دہرانے کے بعد ہر مرتبہ وہ مجمع کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا بھی تھا کہ

جو میری تواضع ہوئی اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آگے کی کارروائی سے مجھے معاف رکھا جائے، مجمع میں موجود منچلے نوجوان اس "پر لطف" صحبت کو دیر تک باقی رکھنے کی غرض سے ہر قسم کے سوالات کی بوچھار کر رہے تھے اور وہ بے چارہ اپنے جرم عظیم کی پاداش کے طور پر نہایت خندہ پیشانی سے سب کا جواب دیے جا رہا تھا، کچھ سنجیدہ قسم کے لوگ "ہٹو ہٹو، ختم کرو" کے نعرے بھی بلند کر رہے تھے، مگر بھلا اس وقت ان کی مان کر مزے کو کون کرکرا کرتا، آخر کار یہ ڈرامہ اپنے فلاپ سین کو اس وقت پہنچا جب چوراہے پر گشت کرنے والے پولیس کانسٹبل نے مداخلت کرکے مجمع کو منتشر کیا اور حالات کا جائزہ لے کر سرسری فیصلہ سناتے ہوئے اس نوجوان کی جاں بخشی کا حکم سناتے ہوئے "آئندہ احتیاط" کی اسے تلقین کی۔

اس "شریف سے" نوجوان پر اس حادثہ کا کیا ردعمل ہوا، اور اس کی زندگی کے معمولات میں کیا تبدیلی آئی، یہ تو میں بتا نہیں سکتا، کیونکہ پھر ان کی زیارت سے مشرف ہونا نصیب نہ ہو سکا، مگر میں ضرور اتنا سہم گیا ہوں کہ راستہ گلی چلتے اب کسی "ہستی" سے بات کرنا تو کیا اس کے قریب چلنے سے بھی ڈرنے لگا ہوں، کہ مبادا کہیں کسی "حادثہ" کا شکار ہو کر اپنی عزت و آبرو سے نہ ہاتھ دھونا پڑے۔

یہ تو دو ایسے حادثات کا ذکر ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح مجھ سے ہے نہ جانے اس جیسے اور اس سے بھی اہم اس قسم کے کتنے ہی حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور لوگ "سب چلتا ہے" کے موڈ میں ان کو نظرانداز کرتے رہتے ہیں، مگر جن پر گذرتی ہے، نقصان کے بارے میں تو کچھ انھیں کا دل جانتا ہے۔

ان حادثات کا سبب ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ ہے "غلامی بنام آزادی"

کی ہوس، یعنی اخلاقی قدروں، مذہبی بندشوں، سماجی تقاضوں اور تہذیبی روایتوں سے فرار!!

اسلام نے مرد و عورت دونوں کے دائرہ کار، لباس اور وضع قطع ہر چیز کو الگ الگ رکھا ہے، کیا آئے دن ہونے والے ان "سنگین حادثات" کے بعد بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس کی مصلحت کیا ہے، اور اس میں کون سے فوائد پوشیدہ ہیں۔؟؟

ملّا، مولوی، مولانا صاحب

آپ جانتے ہیں کہ یہ کون سا دور ہے؟ یہ ہے مشینی دور! اٹیمی دور! سائنسی دور! ٹکنالوجی دور! اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جرم جرم کو کہنا سب سے بڑا جرم ہے۔ اگر آپ مجرم ہیں اور جرم کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں تو آپ کے جرم کو "ٹیکنک" کا نام دیا جائے گا۔ آپ کو سمجھ دار آدمی قرار دیکر آپ کی عزت کی جائے گی۔ اور اگر آپ جرم نہیں کر سکتے اور مجرموں کو برداشت کرنے میں آپ کو تامل ہے تو آپ کو "خشک، بد دماغ اور بے فیض" آدمی سمجھ کر کاٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ کا مذاق اڑایا جائے گا، اپنے بیگانے ہو جائیں گے اور پھر آپ کا بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

آپ چاہے اسے اپنے دور کا المیہ کہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ الفاظ کی ہیر پھیر کے اس عہد میں عیب کا نام ہنر اور ہنر کا نام عیب پڑ چکا ہے۔

میں بھی آپ ہی کے دور کا ایک آدمی ہوں، اور آپ ہی کی طرح یہ سب کچھ برداشت کرتا رہتا ہوں، لیکن ایک "ایکسیڈنٹ" نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ آپ سے کچھ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

ابھی کچھ دن پہلے سڑک پر ایک "بابو جی" نے ایک رکشے والے کو "اے ملّا جی"

کہہ کر آواز دی، رکشہ والا جس نے داڑھی چھوڑ رکھی تھی، بابوجی کی آواز پر ان کے قریب آیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا، بابوجی! "میں ملا جی نہیں، میرا نام رام اوتار ہے" اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔ بابوجی بولے، چلو رام اوتار ہی سہی، اور پھر اس کے رکشہ پر بیٹھ کر چلے گئے۔ اور میں! میں اسی جگہ کھڑے سوچنے لگا کہ آخر ان بابوجی کو رکشہ والے کو ملا جی ہی کہہ کر پکارنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ان کی نظر میں اس سے "سستا" کوئی اور لفظ نہیں تھا؟ جی ہاں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ کسی رکشہ والے کو جو داڑھی رکھے ہو (چاہے وہ داڑھی مذہبی نہیں بلکہ منتی ہو) کسی ٹھیلے والے کو جو ٹوپی پہنے ہو، بلکہ ہر اس آدمی کو جس کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ یہ قطعی کچھ پڑھا لکھا نہیں ہے آپ ملا جی یا نرم الفاظ میں مولوی صاحب کہہ کر پکار سکتے ہیں۔

کسی بھی شخص کو خواہ وہ کیسے ہی سوٹ بوٹ میں ہو آپ ڈاکٹر صاحب، وکیل صاحب، انجینیر صاحب کہہ کر نہیں پکار سکتے، جب تک کہ آپ کو یقینی طور پر اس کی حاصل کردہ ڈگری کا علم نہ ہو جائے، مگر ہر اون جلول کو، ہر پریشان و خستہ حال کو آپ ملا یا مولوی ۔ ۔ ۔ کہہ کر پکار لیتے ہیں کیونکہ آخر اسے آپ مولوی یا ملا بھی نہ کہیں تو پھر کیا کہیں؟

کسی زمانہ میں ملا یا مولوی بننا بہت مشکل کام ہوا کرتا تھا۔ اور بہت بڑی بات بھی! یہ اس زمانے کی بات ہے جب ملا، ملا مبین۔ ملا جلال۔ ملا حسن اور ملا جیون ہوا کرتے تھے اور مولوی بابائے اردو عبدالحق اور ڈپٹی نذیر احمد کہے جاتے تھے مگر آج کل؟ آجکل تو اس کا استعمال کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کوئی بددعا ہے یا گالی! ہاں ایک لفظ ہے جو آج بھی بھاری بھر کم مانا جاتا ہے اور جس کو ہر

آڑے ترچھے کیلئے عام لوگ استعمال سے گریز کرتے ہیں اور وہ ہے لفظ "مولانا صاحب"!
نتیجہ یہ ہے کہ اس لفظ یا خطاب کو حاصل کرنے کے لئے الکشن کے ٹکٹ کیطرح
ٹوپی اور داڑھی والے لوگ خواہش مند نظر آتے ہیں چونکہ اس لفظ سے اب بھی بڑائی
کا تصور ہوتا ہے اس لئے اس کا تعلق عام لوگوں سے بہت کم ہے اور زیادہ تر اس
کے استعمال کرنے والے اپنے اپنے "مفاد" کے پیش نظر ذاتی طور پر خود ہی اپنے
ناموں کے ساتھ اسے جوڑ کر بقلم خود "مولانا صاحب" بننے کے لئے کوشاں رہتے ہیں،
چنانچہ اس خطاب کا اپنے کو جائز اور آئینی حقدار سمجھنے اور سمجھانے والوں کی جو قسمیں مجھے
دریافت ہو سکی ہیں وہ مع ذاتی خصوصیات کے کچھ اس طرح پر ہیں۔

مسجد والے مولانا صاحب یہ لوگ محض مسجد میں اذان دینے یا زیادہ سے زیادہ نماز پڑھانے کی وجہ سے اپنے کو "مولانا صاحب"
کہلوانے کا حق دار سمجھتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ میں خدمت دینیہ میں مصروف ہوں،
عبادت کرتا ہوں، اور خدا کے گھر کی خدمت کرتا ہوں، ساتھ ہی خدا کی مخلوق کی خدمت
ایک اہم فریضہ کو ادا کرا کرتا ہوں۔ اس لئے میرا "مولانا صاحب" ہونا بہت ضروری
ہے، یہ اپنے کار منصبی پر پانے والے معاوضہ کو اس وقت تک ناقص سمجھتے ہیں جب
تک ان کو ان کا جائز اور آئینی خطاب نہ مل جائے، یہ اپنے لئے مسائل دینیہ کے
حاصل کرنے اور ان کا علم رکھنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اپنے صیغہ میں اپنے کو
خود مختار اور آزاد سمجھتے ہیں، جس میں کسی کو مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اگر مؤذن
ہیں تو اذان میں اور اگر امام ہیں تو نماز کی قرأت میں مصری و حجازی تمام لہجوں کا استعمال
ضروری سمجھتے ہیں اور وقف، وصل اور مد وغیرہ کی تمام تجویدی حد بندیوں کو

تصور کرتے ہیں۔

گاؤں والے مولانا صاحب

شادی بیاہ اور بیماری و موت سے لیکر عبادات و معاملات کے تمام مسائل کو طے کرنا، گاؤں والے مولانا صاحب،، کی خود اپنے طرف سے عائد کردہ ان کی ذمہ داری ہے، ان "مولانا صاحب،، کے مولانا ہونے کی ان کے اپنے خیال کے مطابق اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ نماز و روزہ تو کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ تمام نذر و فاتحہ کی ذمہ داری بھی ان ہی پر عائد ہوتی ہے، اس کے علاوہ فتویٰ صادر کرنا، امامت کرنا اور گاؤں کے تمام لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے دینی و دنیاوی تمام معاملات میں اپنا حکم محکم سنانا بھی ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

اپنی عزت و وقار اور اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے ان کو اردو کی کچھ دینی کتابیں بھی اپنے مکان کے کسی نمایاں جگہ پر رکھنا پڑتا ہے چاہے ان کو پڑھنے کی کبھی نوبت نہ آئے، اور وہ دیمک کی نذر ہی ہو جائیں، بلکہ اس کی بھی قید نہیں کہ پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی ہو۔

ہر پڑھے لکھے آدمی سے بغض رکھنا ان پر اس لئے لازم ہے کہ وہ کسی وقت بھی ان کیلئے خطرہ بن سکتا ہے، باہر سے آنے والے ہر "مولوی نما،، شخص کو یہ بڑے غور سے دیکھتے ہیں، اور اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں، اگر وہ ان کا "ہم پیشہ،، یا محض ایک مسلمان ہوا، تو جاں بخشی ہوئی اور اطمینان کی سانس لی۔ اور اگر کہیں یہ علم ہو گیا کہ یہ تو واقعی "مولانا،، ہے تو غضب ہو گیا، اب اس کے عیوب بیان کرنا، اور اس کے پورے خاندان کو دین دشمن ٹھہرانا اور گاؤں والوں کو اس سے بچے رہنے کا "ہمدردانہ مشورہ،، دینا ان کیلئے

بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ بزعم خود یہ ان کی اہم دینی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اس پورے "مولانا صاحب" سلسلہ کی سب سے اہم اور سب

خاندانی مولانا صاحب سے خطرناک کڑی!

جس طریقہ سے مسیحی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ساری امت کی طرف سے گناہوں کے کفارہ میں اپنے کو سولی پر لٹکوا کر جان دیدی، اور اب گویا ان کی امت کے گناہگاروں کو سزا انہیں بھگتنا پڑے گی، جنت کے وہ حق دار ہیں۔ کیونکہ ان کی طرف سے ان کے نبی نے قربانی پیش کردی۔ ٹھیک اسی طریقہ پر ان "مولانا صاحب" کے خاندان میں اگر سات پشت اوپر تک کوئی عالم باعمل اور مرد صالح گزرا ہے تو یہ اپنے کو نہ صرف مولانا صاحب کہلوانے بلکہ اس خطاب کی تمامتر "مراعات" حاصل کرنے کا جائز وارث سمجھتے ہیں۔

ہر قید وبند سے آزاد، مذہب واخلاق کی تمام پابندیوں سے بیزار، دنیا اور اس کی تمام تر لذتوں میں سرشار یہ مولانا صاحب نہایت بے پروائی کے ساتھ اپنے کو اعلیٰ وارفع سمجھتے ہوئے اور اپنے سوا تمام لوگوں کو حقیر وذلیل گردانتے ہوئے دوران گفتگو یہ بات واضح کرتے ہیں کہ کس طرح اور کیوں کر بڑائی ان کو زیب دیتی ہے۔ علم وعمل کے سوا تمام چیزیں ان کے اندر موجود ملیں گی۔ یہ مولانا صاحب چونکہ سب سے بڑی "چیز" ہوتے ہیں اس لئے دوسرے مولاناؤں کی طرح داڑھی اور ظاہری دین کو بھی یہ اپنے لئے لازم نہیں سمجھتے، مثلاً ان کے لئے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے، رہا نماز وروزہ کا سوال تو وہ مورث اعلیٰ تو ادا کر ہی چکے ہیں۔

اپنے متعلقین پر یہ بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹتے ہیں اور ان کو ہر طرح سے "نچوڑنا"

اپنا پیدائشی حق تصور کرتے، شامتِ اعمال سے اگر کوئی شخص ان کی کسی حرکت پر اعتراض کر دے، تو اسے ننگ ملت، ننگ دیں بلکہ ننگ انسانیت گردانے بغیر دم نہیں لیتے۔

ناظرین باتمکین! ان مولاناؤں کے سوا ایک قسم مولاناؤں کی اور بھی ہے جسے آپ "واقعی مولانا صاحب" کہہ لیجئے، ان کے اندر وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جن کی طرف قرآن وحدیث نے اشارے کئے ہیں اور جو نائب نبی کے لئے ہونا چاہیئے، مگر یہ قسم آج کے دور میں عموماً غیر مقبول سی ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ یہ نئی دنیا میں نئی نئی باتیں نہیں کرتے، بلکہ وہی چودہ سو سالہ پرانا راگ الاپتے ہیں۔

اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے آپ ان میں سے جس کو چاہیں "مولانا صاحب" کا خطاب دیجئے، ورنہ دعویداروں کی بھیڑ روز بروز بڑھتی ہی جائے گی۔!!

شبرات آئی یا شب برأت

عنوان دیکھ کر گھبرائیے نہیں اور نہ ہی محض ہنس کر ٹال دیجئے، یہ ایک مسئلہ ہے میری ایک پریشانی ہے، اور میرے مستقبل کا دار و مدار اسی سوال کے جواب پر منحصر ہے اس لئے آپ میری مدد کیجئے، اور سچ سچ بتا دیجئے کہ شبرات آتی ہے، یا شب برأۃ آتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی تک تو آپ نے سنا ہو گا کہ اس دور میں مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک "خالص سنی" جنہیں آپ صرف "سنی مسلمان" یا ٹی۔ ایس (ٹھیٹھ سنی کا اختصار) کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، دوسرے "ملاوٹی سنی" جنہیں آپ "وہابی"، اور "دیوبندی مسلمان" یا "تبلیغی جماعت والے مسلمان" یا بہت ہی سادہ لفظوں میں "نماز، روزہ اور دوسرے ارکان دین کو ادا کرنے والے مسلمان" کے نام سے سنتے رہتے ہیں، مسلمانوں کی یہ تقسیم بہر حال کچھ پرانی ہو چکی ہے، مجھے یہاں پر اس سے کچھ بحث نہیں کرنا کہ یہ تقسیم کرنے والے کون "بزرگ" ہیں، کس "مزار شریف" سے یہ بات چلی ہے، اور اس تقسیم کا مقصد اور اس کا فائدہ کیا ہے، کون کون سے "ذاتی منافع" اس سے وابستہ ہیں۔ اور اس پر آشوب دور میں ملت اسلامیہ کو اس قسم کی تقسیم یا تفریق سے کتنا نقصان پہونچ رہا ہے لیکن اب تو بات بہت آگے بڑھ گئی ہے اب تک آدمیوں کی یہ قسمیں ہوتی تھیں، مگر ایک عجیب و غریب دربار کے "عجیب و غریب فتویٰ" نے مجھے

حیران و پریشان کر دیا ہے، فتویٰ ہے کہ در شُبرات سنیوں کی ہے اور شب برأت وہابیوں کی،، تفصیل اس فتویٰ کے صادر ہونے کی یہ ہے کہ میرے ایک دوست کا اصرار تھا کہ نانی اماں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ شبرات ہی کیا جس میں دو چار قسم کے حلوے نہ بنیں، بچے آتشبازی سے نہ کھیلیں، اور عورت، مرد اور بچے سب مل کر دریا کنارے بجرے کا ،، روح پرور،، نظارہ نہ کریں۔ پیسہ نہ ہونے پر قرض لے کر حلوا بنوانا عبادت ہے آتشبازی میں جل کر اگر کوئی خوش نصیب مر جائے تو اس کی یہ موت شہادت ہے دریا کنارے آدھی رات کو کھڑے ہو کر بجرے کا معائنہ کرنا اور اس کو بصد عقیدت دیکھنا عین اطاعت ہے صبح سے شام تک کا یہ پورا پروگرام کار ثواب ہے اور اس میں شریک ہونے والے تمام مرد عورتیں اور بچے بلا شبہ لائق مبارکباد ہیں۔

جبکہ میرا یہ کہنا تھا کہ میاں یہ سب ہماری گڑھی ہوئی باتیں ہیں، ان کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ وہ باتیں ہیں جن سے اپنا جانی و مالی نقصان تو ہوتا ہی ہے غیروں کا بھی اسلام کی سچی تعلیمات پر سے اعتقاد ہٹتا جا رہا ہے! بھلا مذہب کا اس آتشبازی سے کیا جوڑ جو ،، گھر پھونک تماشہ دیکھ،، والی چیز ہے جس میں ہر سال ہزار ہا ہزار روپیہ قوم کا برباد ہو جاتا ہے اور جانی و مالی ہر طرح کا نقصان ہوتا ہے۔

میرے دوست پر میری اس فہمائش کا الٹا اثر ہوا، وہ بگڑ کر بولے، پھر کیا نانی اماں غلط کہتی ہیں؟ جانتے ہو میری نانی اماں کون ہیں؟ عام روزوں سے لیکر ہزاری روزہ،، تک ان کا کوئی روزہ نہیں چھٹتا، ہر سال ان کے یہاں کونڈوں کے موقع پر بہت پر تپاک دعوت ہوتی ہے، اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے پھر بھی اب

تک ماموں جان کو ہر سال محرم میں امام صاحب کے نام کا فقیر بناتی ہیں۔ ہم سب لوگوں کے بڑے اہتمام کے ساتھ ہر سال ,,امام ضامن،، باندھتی ہیں۔ اب کہاں تک تم کو ان کی عبادتیں گنواؤں،، پھر کیا ایسی عبادت گزار اور خدا شناس عورت غلط بات کہہ سکتی ہے؟ نہیں بالکل نہیں!! ہم تو نانی اماں کو مذہبی معاملات میں کسی عالم سے کم نہیں سمجھتے، میں سمجھتا ہوں کہ تم ,,شبرات کی عبادتوں،، کا انکار یا تو کم علمی کی وجہ سے کر رہے ہو، اور اگر ایسا نہیں ہے تو تم پر کسی ,,وہابی،، کا سایہ ہے۔

نانی اماں کی عبادتوں کی طویل فہرست بیان کرنے اور عالم کا درجہ دینے اور ان کی تحقیق پر کامل یقین کا اظہار کرتے کے بعد میرے دوست تو مطمئن ہو گئے حتی کہ آخر میں میرے بارے میں بھی انھوں نے اپنی رائے ظاہر کر دی، مگر میں بھلا اس ,,نیم العقل،، پر کیسے نہ ترس کھاتا، جب کہ وہ میرا دوست بھی تھا، میں نے اپنے اوپر رقت طاری کرتے ہوئے نہایت سوز و گداز کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ,,میرے بھائی بھلا سوچو تو سہی، دین کے معاملے میں نانی اماں کی بات تو نہیں معتبر ہوگی، نہ ہی دین کے سلسلہ میں یہ کہنا کچھ حقیقت رکھتا ہے کہ فلاں کام ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے یہ کام صحیح ہے، اگر غلط ہوتا تو ہمارے بزرگ اسے کیسے کرتے، غلطی بزرگوں سے بھی ہو سکتی ہے اور غلطی بعد میں بیان کرنے والوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے کسی بزرگ نے کوئی کام کسی طرح کیا ہو اور بعد والوں نے اس کو کسی دوسری طرح پیش کر کے اپنے مطلب کے مطابق بنا لیا ہو، اس لئے صرف نانی اماں کی بات پر اعتبار کرتے ہوئے تم ,,شب براءۃ،، جیسی اہم اور مقدس رات کو تہوار یا کھلواڑ مت بناؤ، اور اس کی اہمیت کو ختم نہ کرو،

کتنی سیدھی سادی تھی میری بات، میں تو سمجھا تھا کہ اس پر بھرپور اثر ہوا ہوگا مگر واہ رے میرا یار! جس خاموشی کو میں اس کی توجہ اور دھیان دینا سمجھ رہا تھا وہ تو سستانے کے لئے تھی، چنانچہ اس نے تازہ دم ہو کر اب ایک ایسا حربہ اختیار کیا جو اس کی نظر میں ،،ایٹم بم،، سے کم نہ تھا، اپنے سلسلۂ کلام کو شروع کرتے ہوئے میرا دوست یوں گویا ہوا۔

مگر نانی اماں کوئی اپنی طرف سے یہ باتیں تھوڑی کہتی ہیں، ان کو تو ان کے ،،پیر جی،، نے یہ ساری باتیں بتائی ہیں، وہی ،،پیر جی،، جو سال پیچھے میرے یہاں آتے رہتے ہیں، تم نے بھی تو ان کو دیکھا ہی ہوگا، واللہ کیسی معصوم صورت پائی ہے کتنی کرامتیں دکھاتے ہیں۔ کتنا اثر ہے ان کی پھونک میں، کتنا...... کافی دیر تک میرے دوست ،،پیر جی،، کے فضائل بیان کرتے رہے، اور میرا دماغ ،،پیر جی،، کا نام سنتے ہی ایک نئی گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہو گیا، میرے ذہن و دماغ پر ،،پیر جی،، اپنے بھاری بھرکم جسم اپنے جبہ و دستار اور اپنی سرمگیں آنکھوں کی تمام تر بلا سامانیوں کے ساتھ طاری ہو گئے، میں سوچنے لگا کہ نانی اماں کی کاٹ تو ممکن تھی ان کا جادو تو اتارا جا سکتا تھا، کیونکہ خود نانی اماں کی یہ ضد محض اس وجہ سے ہے کہ ان کو صحیح بات کا علم نہیں ہے میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ براہ راست نانی اماں سے مل کر ان کو صحیح بات بتادی جائے، اللہ توفیق دیگا تو صحیح بات بھی انکی سمجھ میں آجائے گی، اور میرے دوست کی بھی، اور اگر یہ نہ ہوا تو کم سے کم میرے دوست کی سمجھ میں تو آہی جائے گی۔ مگر ،،پیر جی،، کا نام نامی آتے ہی میری قوت ارادی جواب دینے لگی، اور ذہن ان کے بھاری بھرکم جسم کا بوجھ نہ برداشت کرکے

تھکنے لگا، میری پریشانی صحیح بھی تھی، کیونکہ نانی اماں اور میرے دوست دونوں ناواقف تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان کے سامنے جس وقت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل اور آپ کی تعلیمات پیش کر دی جائیں گی۔ یہ فوراً جھک جائیں گے۔ اور اپنی ضد کو چھوڑ کر نبی کی بات مانیں گے، کیونکہ یہی ایمان کا تقاضہ ہے اور یہی مسلمان ہونے کی پہچان ہے، مگر پیر جی؟ پیر جی تو سب کچھ جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ان کی تعلیمات نبی کی تعلیمات سے ٹکرا رہی ہیں، مگر وہ پھر بھی اپنی جبری تعلیمات پر اپنے مریدوں سے عمل کرانا اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ "پیٹ" کا مسئلہ اسی طرح حل ہوتا ہے۔

کچھ دیر تک میں اس بلائے ناگہانی کے بارے میں سوچتا رہا، پھر لاحول پڑھ کر اللہ سے لو لگائی، تب جا کر اپنے حواس پر قابو پایا، اور اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اپنے دل کی بات براہ راست کہہ دی۔

میں نے کہا یہ سب کچھ نہیں، نہ پیر جی نہ نانی اماں اور نہ میں، چلو فیصلہ اس سے کرائیں جس کی بات ماننا میرے اور تمہارے دونوں کے لئے ضروری ہے ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میرے دوست غصہ سے لال پیلے ہو گئے، چہرہ تمتما اٹھا، آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، وہ پیر جی کے ساتھ "نہ" کو برداشت نہ کر سکے، اور منھ سے جھاگ اڑاتے ہوئے نہایت تلخ لہجے میں کہا، پنجتن پاک کی قسم تم پکے "وہابی ہو چکے ہو، اب تمہارے دل میں پیروں، فقیروں کی بھی عزت نہیں رہ گئی۔ اپنے دین و ایمان کی خیر مناؤ، یہ کہتے ہوئے وہ نہایت لاپرواہی کے ساتھ اٹھ کر جانے لگے، میں نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر ان کے نرم گرم بلکہ گرم ہی گرم الفاظ برداشت کیا اور ایک مرتبہ ان کو منانے کی کوشش کرنے لگا، میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی پرانی دوستی

کا حوالہ دیتے ہوئے زبردستی بٹھالیا، اور بغیر کسی تمہید کے جلدی جلدی کہنا شروع کیا کہ بھیا! میرا مطلب یہ تھا کہ بات سچی وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بتائیں، چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ شب براءۃ وہ مقدس رات ہے جس میں اللہ پاک اپنے بندوں کے سال بھر کے رزق کا فیصلہ کرتے ہیں، سال بھر میں پیدا ہونے والوں اور سال بھر میں مرنے والوں کی فہرست تیار کی جاتی ہے اور اللہ پاک آسمانِ دنیا کی طرف توجہ فرماتے ہیں، اور رات بھر یہ صدا لگائی جاتی رہتی ہے کہ ہے کوئی نیکی کا طلب کرنے والا، جسے میں نیکیاں دیدوں، اور ہے کوئی برائیوں سے نجات مانگنے والا، کہ اس کی برائیوں کو ختم کردوں، یہی نہیں بلکہ نیکوکار اور بدکار دونوں کو سمجھایا بھی جاتا ہے کہ اے اچھائیوں کے چاہنے والے جلدی بڑھ تاکہ تیری جھولی اچھائیوں سے بھر دی جائے، اور اے برائیوں ہی کے چاہنے والے آج کی رات تو رک جا۔!

اب تم ہی بتادو کہ اس مبارک رات میں نمازیں، تلاوتِ قرآن مجید اور نیکیوں کی طلب اور شر سے بچت کے لئے دعائیں ہونی چاہیئے، یا بجرے کا نظارہ اور آتشبازی۔

مسلمان کتنا ہی بدعمل ہو لیکن اگر اس کے دل میں ایمان کی رمق بھی باقی ہے تو حضور علیہ السلام کے نام پر اس کا سر جھک ہی جاتا ہے، چنانچہ میرے دوست پر بھی اس کا اچھا اثر ہوا، اور تمتماتے ہوئے غضبناک چہرہ پر مسکراہٹ کچھ اس طرح نمودار ہوئی، جیسے خشک دھان پر بارش کے پہلے زوردار چھینٹے کا اثر، لیکن ابھی اس کیفیت کو ذرا ہی دیر گذری تھی کہ چہرہ کا رنگ پھر بدلنے لگا، اور ان کے چہرہ کے رنگ کے ساتھ ساتھ میرے دل کی دھڑکن بھی بدلنے لگی، آنے والے خطرہ کو تاڑتے ہوئے میں نے "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد شروع کر دیا، اچانک

ان کی زبان سے نکلا۔ ”مگر پیر جی؟“
میں نے ان کے منہ کی بات یہیں سے اچک لی، اور کہا چلو پیر جی سے ہم تم دونوں مل کر پوری بات پوچھیں، میرے دوست اس پر راضی ہو گئے، چنانچہ دوسرے روز ہم دونوں ..... شریف کیلئے پیر جی کے دربار میں حاضری دینے کی غرض سے روانہ ہو گئے، راستہ بھر مجھے کن صبر آزما مراحل کا سامنا کرنا پڑا، اس کی تفصیل پھر کبھی بتاؤں گا بہر حال کسی نہ کسی طرح پیر جی کی خدمت میں حاضری دی، پیر جی اس وقت اپنے شیدائیوں اور شیدائیوں کو ”روحانی تعلیم“ دینے میں مصروف تھے اور خاص توجہ ”شیدائیوں“ پر فرما رہے تھے، کیونکہ روحانیت کو ان کے ذریعہ زیادہ فروغ ہوتا ہے ہم دونوں بھی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد جب پیر جی کی مصروفیت کم ہوئی تو موقع پاکر میں نے اپنا مقدمہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کر دیا ساتھ ہی جلدی جلدی تمام دلائل بھی سنا دیئے، مقدمہ کی سماعت کے دوران پیر جی قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورتے رہے اور پھر اپنا دو ٹوک فتویٰ صادر فرمایا وہ معرکہ آرا فتویٰ جسے آپ لوگ بھی نقل کر کے بحفاظت رکھ لیجئے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے، پیر جی نے فتویٰ دیا کہ ”شبرات اور اس کے متعلق تمام لوازمات پر ایمان رکھنے والا“ صحیح العقیدہ سنی مسلمان“ ہے کیونکہ شبرات سنی ہے اور اسے سنی ہی مانتے ہیں، اور شب براءۃ اور اس کی ”من گھڑت“ باتوں کو پھیلانے والے وہابی مردود ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔
اس فتویٰ کا میرے اور میرے دوست کے تعلقات پر کیا اثر پڑا ہوگا، اسے آپ خود سمجھ سکتے ہیں، مجھے تعلقات کی خرابی اور اپنی محنت کی بربادی کا اتنا دکھ نہیں

ہے جتنی فکر اس کی ہے کہ پیر جی کے فتویٰ کے بعد میں کیا ہوں، کیونکہ میرا تو عقیدہ آج بھی ,,شب براءۃ،، پر ہی ہے۔

اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے مجھے اس مشکل سے نجات دلائیے، میری پریشانی میں مدد کیجئے، اور بتائیے کہ کیا میں مسلمان ہوں؟

روزہ و سحری وغیرہ....

”بھئی بڑی مشکل ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مذہب نے زور زبردستی سے روک دیا ہے تو ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ زبردستی کریں، اور کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت کریں،،

اپنے محلے کے ایک خوش فکر ترقی پسند مسلمان کو باآواز بلند ٹرک پر یہ کلمات ادا کرتے میں نے سنا، تو تفتیش حال کیلئے ان کے قریب پہنچا، اور بڑی ملائمت سے پوچھا کیا بات ہوگئی، ”میرا ان سے اتنا پوچھنا جلتے پر پٹرول کا کام کر گیا، بگڑ کر بولے کیا کہوں، ان مولوی ملاؤں کے ڈھکوسلوں سے طبیعت عاجز آگئی ہے، اللہ بچائے ان کے ظلم و ستم سے، دیکھو تو سہی جب مذہب نے عبادت وغیرہ میں کسی قسم کی زبردستی کو نہیں کہا ہے تو ان کو کیا حق ہے کہ زبردستی کریں۔ میں نے نہایت ہی فرمانبرداری کے ساتھ بیشک بیشک کہا، ساتھ ہی نہایت ہی غلامانہ انداز میں اپنے سر کو جھکا لیا۔ اور پھر یوں گویا ہوا، لیکن بات کیا ہوئی، کچھ بتائیے تو سہی، فرمایا۔ بات کیا ہوئی، رمضان کا مہینہ ہے ہمیں معلوم ہے کہ اس میں روزے رکھے جاتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں کوئی زور زبردستی تو نہیں کی جاسکتی، میری کچھ اپنی ضرورتیں ہیں، کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتا ہوں، اب کسی کو میرے اس ذاتی معاملہ میں

مداخلت کا کیا حق ہے؟ میں ابھی کھانا کھانے کے بعد منھ میں پان کی گلوری دبا کر اپنے کام کیلئے نکلا تو راستہ میں وہ مولوی صاحب مل گئے، وہی جو موڑ پر رہتے ہیں، شاید کسی مدرسہ وغیرہ میں پڑھاتے ہیں، مجھ سے ٹوک کر بولے کہ آپ کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے، اوّل تو آپ کو مسلمان ہونے کے ناطے روزہ رکھنا چاہیئے، روزہ فرض ہے اور اس کو بلا عذر شرعی چھوڑنے والے کی سخت سزا ہے اور اگر کسی وجہ سے آپ روزہ نہیں رکھ سکتے تو کم از کم روزے کے احترام میں آپ کو اتنا تو کرنا ہی چاہیئے کہ اس طرح دن دہاڑے پان کھاتے ہوئے سڑک پر نہ نکلیں،

پوچھیے صاحب! کیا میں ان کا دیا کھاتا ہوں؟ یا کسی کا ڈر پڑا ہے جو سڑک پر پان کھا کر نہ نکلوں؟ آپ روزہ ہیں، روزہ رہیئے، میں نے روزہ نہیں رکھا میں کھاؤں گا، آپ کو مداخلت کرنے کا کیا حق ہے؟ مجھے کئی آدمیوں کے سامنے مولوی صاحب نے ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے اور قریب سبھی لوگ ان کی تائید کرنے لگے یہ تو ہے اس محلہ کا حال، بتائیے کیا یہی ہونا چاہیئے،؟ انھوں نے ،،بتایئے،، پر زور دیتے ہوئے میرے شانوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ دیتے ہوئے کہا۔ بتائیے نا، کیا بات مناسب ہوئی؟ میری ساری فرمانبرداری تو رفو چکر ہو گئی البتہ میں انکو جواب دینے کے لئے اپنے دماغ کے ذخیرہ سے مناسب الفاظ چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنے لگا، اچانک انھوں نے پھر اپنا سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے فرمانا شروع کیا، کہ بات دراصل یہ ہے کہ مولوی صاحب خود بھی پان کے عادی ہیں، مجھے پان کھاتا دیکھ کر ان کو لالچ آگئی اور بیچارے روزہ کی پابندی کی وجہ سے تلملا کر رہ گئے، ان کے بس میں اور کچھ تو تھا نہیں، بس مجھ ہی پر برسنا شروع کر دیا،

ارے بھئی اگر ایسی ہی بے چینی تھی تو روزہ رکھا کیوں، کوئی گردن تھوڑی ہی ماردی جاتی۔ لیکن ایک بات بتائیے، میں نے ان کے جھگڑے کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان سے سوال کیا۔ کہ آخر وہ کون سی ضرورتیں اور مجبوریاں ہیں جنھوں نے آپ کو روزہ رکھنے سے روک دیا، جبکہ آپ ماشاراللہ ہٹے کٹے تنومند آدمی ہیں؟ پہلے تو انھوں نے مجھے مشکوک نگاہوں سے گھورا، کہ کہیں میں بھی مولوی صاحب کی تائید پر تو نہیں اتر آیا ہوں، مگر پھر میرے اطمینان دلانے پر کہ میں کوئی اعتراض نہیں کر رہا ہوں، بلکہ صرف صحیح بات کی جانکاری حاصل کرنا چاہتا ہوں، وہ بولے۔

اب تم سے کیا چھپاتا، صحیح بات یہ ہے کہ روزہ کھلتا ہے، اور مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا، بات اصل میں یہ ہے کہ جوانی میں تو یہ سوچ کر ٹالتا رہا کہ ابھی پوری عمر پڑی ہے، عبادتوں کا زمانہ تو بڑھاپا ہے، ابھی جوانی ہے چند روز کی بہار ہے، رنگ رلیاں کر لوں، پھر جوانی لوٹ کر نہیں آئے گی، ابھی سے روزہ نماز کر کے اپنے اوپر بڑھاپا کیوں طاری کیا جائے، بڑھاپا آنے پر خوب روزے نماز کر کے اللہ میاں کو راضی کر لونگا، اور بس عمر بھر کی تلافی ہو جائے گی، مگر اب جب بڑھاپا آیا، تو روزہ رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، عمر بھر کی عادت چھڑائے چھٹتی نہیں، بھوک پیاس برداشت نہیں کر پاتا ہوں، اس کے علاوہ کم بخت یہ تمباکو کی لت اور بھی پریشان کرتی ہے، ایک مرتبہ سب لوگوں کے بے حد اصرار پر ایک روزہ رکھا، دن بھر تو جیسے کیسے کٹا، مگر آخر عصر کے وقت افطار کرنا پڑ گیا۔ جی! میں اس آخری جملے پر چونک پڑا، اور دیدے پھاڑ کر ان سے سوال کیا، آپ نے کیا فرمایا، عصر کے وقت افطار کرنا پڑ گیا؟ انھوں نے اپنی طرحدار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

نہایت فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، ہاں ہاں واقعی ایسا ہی ہوا تھا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے گفتگو نہ کر رہے ہوں، بلکہ منہ چڑھا رہے ہوں، جی تو آیا کہ ایک فرمائشی قسم کا تھپڑ رسید کروں، جس سے ساتوں طبق روشن ہو جائیں مگر پھر ان کی بزرگی کا خیال کر کے اور کچھ بات بڑھ جانے کے ڈر سے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا، اور اپنے غصے کو ضبط کر کے ان سے کہا، اجی جناب اور ہم لوگ کس طرح روزہ رکھ لیتے ہیں، جواباً نہایت ہی متکلمانہ انداز میں فرمایا کہ

بات یوں ہے کہ قدرت کی طرف سے ہر آدمی کے ذمہ الگ الگ خدمت ہوتی ہے اور اس کے مقدر میں اس کی زندگی کے اعمال لکھ دیئے جاتے ہیں آپ لوگوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ نماز روزہ کر لیجئے بس! اور ہم لوگوں کے ذمہ دین و ملت کی دوسری خدمت ہے، آخر بال بچوں کے لئے کمانا، ان کا پیٹ بھرنا اور اپنے اعزہ اقربا کا خیال کرنا بھی تو دین ہی کی خدمت ہے، آپ لوگوں کے ذہن بہت فرسودہ ہو چکے ہیں وہی لکیر کے فقیر، بھلا بتایئے تو سہی، وہ دین ہی کیا جس کے تقاضے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ نہ بدلتے رہیں، کم از کم اسلام ایسا مذہب ہر گز نہیں ہے پھر اس میں اس قسم کی گنجائش کیسے نہ ہوگی، عرب کے قوی اور تندرست ہوتے تھے، ان کے جسم مضبوط ہوتے تھے اس لئے ان پر ایک مہینے کے روزے رکھے گئے، آج کے ڈالڈا چھاپ مسلمانوں میں وہ کس بل کہاں، لہٰذا اُن پر ایک مہینے کے روزے یقیناً گراں ہوتے ہیں، اب آپ لوگوں کو ان باتوں پر توجہ کرنی چاہیئے، میں ان کی قوت فکر اور طرز استدلال پر عش عش کرتا رہ گیا، واقعی کیا دماغ پایا ہے، میں نے عرض کیا۔ فرمایا بندہ نوازی ہے

میں نے کہا! جناب عالی! آپ کو یہ بتادوں کہ جس طرح آپ کے ذاتی معاملات میں کسی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے اسی طرح مذہبی معاملات میں آپ کو بھی مداخلت کا حق نہیں ہے، اسلام کے اعلیٰ اصول وہ ہیں جنھوں نے اپنوں ہی سے نہیں غیروں سے بھی لوہا منوالیا ہے، ایک مہینے کے روزے کے کتنے فوائد ہیں ان کو ہم سے نہ پوچھئے غیروں سے پوچھئے، رہ گیا آپ جیسے لوگوں کا روزہ نہ رکھ سکنے کا سوال یا اس میں کمی ہو جانے کا خیال تو اس کی اصل وجہ وہ نہیں کہ قدرت کیطرف سے بعض کے مقدر میں اطاعت و فرمانبرداری لکھی ہوتی ہے کامیابی و کامرانی لکھی ہوتی ہے، اور بعض لوگوں کے مقدر میں محرومی و ناکامی، اطاعت گذار اشارہ پاتے ہی جھک جاتا ہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرلینا چاہتا ہے، اور نافرمان بہانے تراشتا ہے اور شیطان اس کا مشیر و مددگار ہوتا ہے، اب فیصلہ آپ خود کر لیجئے کہ آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے، اندازہ کرنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے ابھی چند دنوں کے بعد عید آرہی ہے، اسی دوسرے والے گروہ کے بہت سے افراد مارے باندھے شرما حضوری میں عیدگاہ جائیں گے اور سال میں ایک مرتبہ کی اس نماز کی ادائیگی میں ان کو جن جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑیگا، اور جو جو مسخرہ خیز حرکتیں ان سے سرزد ہونگی وہ دیکھنے کے قابل ہوں گی بجائے نماز میں اللہ پاک کی طرف دھیان ہونے کے اپنے بغل والے کے نقل و حرکت پر نگاہ ہوگی، امام عید عید کی زائد تکبیر کہے گا تو یہ رکوع میں ہونگے، اور امام جب رکوع کے لئے تکبیر کہے گا تو یہ سجدہ میں نظر آئیں گے، آپ خود غور کیجئے کہ یہ محرومی نہیں ہے تو اور کیا ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کو اللہ پاک نے اپنی عبادت سے محروم کر دیا ہے کیا یہی بندگی

کا تقاضہ ہے کہ خدا کے دربار میں حاضری دینے کا بھی ڈھنگ معلوم نہ ہو؟ مجھے
یقین تو نہیں تھا کہ ان پر میری اس بات کا اتنی جلدی اثر ہوگا، مگر سچ ہے کہ خدا
کو نوازنے میں دیر نہیں لگتی، میرے دوست پر میری باتوں کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ زار
و قطار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، کہنے لگے میرے بھائی تم نے دل
پر وہ چوٹ ماری ہے کہ اب کبھی بھول نہ سکونگا، آج ہی جا کر غور کرونگا کہ تمہارا
نقطہ نظر صحیح ہے یا میرا، اور غور کرنے کے بعد اپنے فیصلے سے تم کو مطلع کرونگا
مجھے ان کے فیصلے کا انتظار ہے........ قتل کے اس مقدمہ کے فیصلے
کی طرح جس میں ملزم کی زندگی کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا سوال ہوتا ہے، کاش کہ
ان کو میرا نقطہ نظر صحیح لگے، !!

ترقی پسند مسلمان

ترقی پسندی بہت ہی عمدہ چیز ہے اس سے نہ کسی کو انکار ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، پرانوں کی کہاوت ہے کہ "حرکت میں برکت ہے"، لہذا ہم تو یہی یقین کرتے ہیں کہ ترقی میں فائدہ ہے، مال کا فائدہ، وقت کا فائدہ اور سب سے بڑھکر دماغی محنت سے بچت کا فائدہ، اب یہ دوسری چیز ہے کہ یہ فائدے کبھی آپ کو ہوتے ہیں کبھی دوسروں کو، مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترقی سے کچھ فائدہ ہی نہ ہوا، جیسے آپ آج کل کی ایک ترقی یافتہ چیز بالوں کو لے لیجئے، پہلے بالوں کی تراش خراش اور ان کی نوک پلک درست کرنے پر کتنا پیسہ خرچ ہوتا تھا، اور کتنا وقت ضائع ہوتا تھا، بڑی بڑی دوکانیں کھلی ہیں جدید ترین آلات کے ذریعہ بالوں کو توڑ توڑ کر قابو میں لایا جا رہا ہے۔ الٹے بال، پلٹے بال، گھنگھریالے بال مشین کے ذریعہ ہر قسم کے بال تیار کئے جا رہے ہیں، اور ان تمام چیزوں پر نہ جانے کتنا پیسہ ضائع ہو رہا ہے اور وقت کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، مگر خدا بھلا کرے ترقی کا کہ اس کے طفیل ان تمام جھنجھٹوں سے نجات مل گئی، اب چاہے بار بار اسٹرائک کریں یا دھرنا دیں، آج کا ترقی یافتہ جوان، ان کے جھانسوں میں آنے والا نہیں، چشم بد دور کیسی پیاری پیاری صورت لگتی ہے کانوں کی لو تک لہراتی ہوئی کٹاری زلفیں رکھنے والے جوانوں کی"

جانتے ہیں آپ! اس کا دوہرا فائدہ ہوا ہے، ایک فائدہ تو یہ کہ اب کسی باربر کی دوکان پر بیٹھ کر ویٹنگ لسٹ سے اپنا نام پکارے جانے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا، اور نہ ہی بالوں کی تراش خراش کرانے کی زحمت اٹھا کر اتنا روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے یہ تو ہوا اپنا ذاتی فائدہ، اسی کے ساتھ ساتھ ایک قومی بلکہ بین الاقوامی فائدہ تو ایسا ہے کہ جو "ایک پنت دو کاج" کے طریقہ پر بغیر کسی محنت اور کوشش کے حاصل ہو جاتا ہے، آج کل عورتوں کی فکر دنیا کے ہر ملک کو ہے، خصوصاً ہمارے ذہنی آقا "یورپ"، جن کی پیروی یقیناً ہمارے لئے باعث نجات دنیوی ہے ان کو اس کی بہت فکر ہے اور ہر طرح سے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مرد اور عورت کا درمیانی فرق ختم ہو جائے، عورت مرد کہلانے لگے، ایک دوسرے میں کوئی امتیاز باقی رہنا ظلم ہے عورت کو بہت دن مرد نے اپنی ماتحتی میں رکھ کر ظلم وستم کی چکی میں پیسا، اسے مجبور کیا، اسے خانہ قید کر دیا، پردہ جیسی غیر انسانی مصیبت اس پر مسلط کر دی۔ مگر اب یہ سب کچھ ختم ہونا چاہیئے، عورت کو اس کے حقوق ملنا چاہیئے، آزادی اس کا بھی حق ہے، ملازمت اس کا بھی حق ہے، مارکٹنگ اس کا بھی حق ہے سیر و تفریح اس کا بھی حق ہے، غرضیکہ مرد و عورت میں فرق ہی ناانصافی ہے لباس میں، وضع قطع میں، بول چال میں، سیر و تفریح میں بلکہ ہر چیز میں جس طرح مرد ہے اسی طرح عورت، پھر دونوں میں تفریق ناانصافی اور سراسر ظلم ہے۔

یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اس فرق کو ختم کرنے کی ذمہ داری ہر ملک پر عائد ہوتی ہے خصوصاً ملک کے نوجوانوں پر جو قوم کی ریڑھ کی ہڈی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں یقینی طور پر قابل مبارکباد ہیں وہ نوجوان جو اپنے عمل کے ذریعہ یہ ثابت

کرتے ہیں کہ انھوں نے اس فرق کو مٹا دیا۔

بالوں کا معاملہ بھی اب سے کچھ دن پہلے امتیازی نشان بنا رہتا تھا عورتوں کے بال دوسری طرح کٹے اور لمبے ہوتے تھے، مرد کے دوسری طرح، اس ترقی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب اس قسم کا کوئی امتیاز نہیں رہا، اور دور سے آپ لڑکے لڑکی کی تفریق کو نہیں بھانپ سکتے، یہ تو ہوئی ایک بالوں کی مثال کہ اس میں ترقی ہونے سے کتنا فائدہ ہوا، اگر آپ غور سے دیکھیں تو ہر وہ چیز جس میں "ترقی" کی جھلک آپ کو نظر آئے گی اس میں فائدہ ہی فائدہ ملے گا، آپ لباس ہی کو دیکھ لیجئے ایک پینٹ یا شرٹ بنوانا ہے، کپڑا دیکھئے، کلر دیکھئے، ڈیزائن دیکھئے، پھر ٹیلر ماسٹر کو اونچ نیچ، آڑے ترچھے کے لئے ہدایات دیجئے، اور ان تمام جھمیلوں کے باوجود اگر کسی چیز میں ذرا سی چوک ہو گئی تو دوست احباب کی پھبتیاں سنیئے "اماں کیا لیڈیز کپڑا لے لیا"، کوئی کہتا اسے پہن کر تو دور سے لڑکی لگو گی، کوئی آوازہ کستا "چلو اب ایک گرل فرینڈ (دوست لڑکی) بھی اپنے گروپ میں ہو گئی"، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں اور یہ سب محض اس وجہ سے کہ لڑکی اور لڑکے کے لباس میں فرق تھا رنگ الگ الگ، ڈیزائن الگ الگ، کٹنگ الگ الگ اور پھر سلائی کا اسٹائل بھی الگ الگ، لیے نام "ترقی" کا جس کی بدولت ان مصیبتوں سے چھٹکارا مل گیا، اب "کلر چوائس" کا مذاق نہیں اڑایا جا سکتا، اب دوستوں کی ٹانٹنگ سے بھی نجات مل گئی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب ٹیلر ماسٹر کے نخرے جھیلنے اور ان کی ناز برداری کرنے سے فرصت حاصل ہو گئی کیونکہ اب وہ جھگڑے باقی نہیں رہے نہ ہی "مردانہ و زنانہ" لباس کا فرق رہا، اور نہ ہی اتنی باریک سلائی و کٹنگ، اس لئے دوستوں

کے طعنوں اور ٹیلر کے نخروں دونوں سے بیک وقت نجات مل گئی، بلکہ موجودہ رفتار
ترقی بڑی خوش آیند ہے، پینٹ کا پھیلاؤ جس طرح بڑھ رہا ہے اور پائنچے جتنے جتنے
چوڑے ہوتے جارہے ہیں اتنی اتنی ہی میری امیدیں بڑھتی جارہی ہیں مجھے امید ہی
نہیں بلکہ اب یقین ہو چلا ہے کہ اگر یہی رفتار ترقی کی رہی تو وہ دن دور نہیں جب ڈبل
نٹ اٹیری کاٹ اور پولسٹر کے ٹکڑے یونہی پینٹ لئے جایا کریں گے، سلوانے اور کٹوانے
کا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے گا، کاش کہ وہ دن جلد ہی آجاتا، تاکہ سلائی کے پیسوں
کی بے وجہ بربادی نہ ہوتی، کیونکہ اب تو کپڑے "سلے اور بے سلے" کا سنگم ہوتے ہیں،
بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ ترقی پسندی فائدہ مند چیز ہے اس کا فائدہ ضرور
ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ فائدہ آپ کو نہ پہنچے دوسرے کو پہنچے مگر فائدہ ہوگا
ضرور! یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا آج ترقی کے پیچھے بھاگ رہی ہے انجام کی پرواہ
کئے بغیر، مستقبل کا خیال کئے بغیر! پھر بھلا مسلمان اس میں کیسے پیچھے رہ سکتے،
وہ بھی تو آخر دنیا ہی کی آبادی میں کی ایک قوم ہیں مگر یہ یاد رکھئے مسلمان ہمیشہ سے
آگے رہنے کے عادی ہیں پیچھے رہنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس
لئے پیدا کئے گئے ہیں، ان کے حصہ میں تو قیادت ہے، چنانچہ شروع سے اب تک
کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے، مسلمان جس چیز میں بھی گیا آگے رہا، تو پھر "ترقی
پسندی" میں بھی اسے اپنی اس روایت کو بھی برقرار رکھنا تھا اور رکھا بھی!

اوروں نے تو صرف دنیاوی معاملات میں ہی ترقی کی بات سوچی، لیکن
مسلمانوں نے ترقی کرکے دین و مذہب کے معاملے میں بھی "ترقی پسندی" کا مظاہرہ
کر دیا، اور ہر ایرے غیرے کو اپنا دینی بھائی اور مسلمان ماننے کیلئے تیار ہو گئے!

چاہے وہ دین دشمن ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ قرآن سے کھلم کھلا بغاوت کرنے اور اس میں الٹ پھیر کرنے والے کو، اللہ کے پیارے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پاک اور سچے جانشینوں کو گالیاں دینے والوں کو، ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل خانہ اور تمام مسلمانوں کی ماؤں کو برا بھلا کہنے والوں کو بھی کچھ ترقی پسند، آزاد خیال مسلمان مسلمانوں ہی میں شامل کرتے ہیں، اور ان کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتے ہیں، بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے خلاف کہنے والوں کو گالیاں دنیا دین و مذہب کی صحیح حقیقت بتانے والوں کو فرقہ پرست اور جھگڑالو بتانا، قرآن دشمن کو دائرۂ اسلام سے خارج بتانے والوں کو پیٹ کا شکاری ثابت کرنا بھی "ترقی پسندی" میں شامل سمجھا جاتا ہے اور جب آپ ان "ترقی پسندوں" سے پوچھیے کہ بھئی ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن سے دشمنی رکھنے والے، اللہ کے پاک رسول کی پاک بیویوں کی طرف سے کینہ رکھنے والے، اور آپ کے دین کو ترویج و ترقی دینے والوں سے نفرت کرنے والے بھی مسلمان ہو جائیں، اور قرآن پر یقین کرنے والے، رسول کی بیویوں سے محبت کرنے والے اور آپ کے جانثاروں پر جان چھڑکنے والے بھی مسلمان ہوں، یہ آگ اور پانی کا سنگم ہوگا کیسے، بات تو ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے تو آپ کو یہ جواب دیں گے کہ میاں! اس ترقی یافتہ دور میں اس قسم کی باتیں سوچنا حماقت ہے اپنے کام سے کام رکھو بس! دیکھتے نہیں ہو کہ اس قسم کی باتیں سوچنے میں کتنا وقت برباد ہوتا ہے وہی ٹائم اگر اپنے بزنس میں لگاؤ تو کتنا فائدہ ہوگا، اور اگر کہیں آپ یہ کہہ دیں کہ پھر جب آپ کو اس کی فرصت نہیں ہے کہ مذہبی معاملات پر غور و فکر کریں تو آپ کو اس کا حق کیسے پہنچا کہ آپ ان لوگوں پر وار کریں جو سوچتے ہیں اور سوچنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ "ترقی پسند" آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آپ کو دین دشمن اور اپنے کو سچا پکا مسلمان اور پابند شرع ثابت کر کے ہی دم لیں گے۔

دوسری طرف وہ "بننے والے مسلمان" جن کو "ترقی پسند" مسلمان نے اپنے ساتھ لگایا ہے وہ مذہب میں ہر قسم کی کتر بیونت کر ڈالنا چاہتے ہیں اور مذہب اسلام کا نام و نشان مٹا دینے کیلئے اس کی ایسی مکروہ شکل دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں کہ دیکھنے والا دور سے ہی نفرت کرنے لگے اور گھن کھا کر پیچھے ہٹ جائے۔

"ترقی پسند" مسلمان کا نظریہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اس وجہ سے ہیں کہ مسلمان کے بیٹے پیدا ہوئے، ورنہ اگر کسی غیر مسلم کے بیٹے ہوتے تو وہی مذہب ہمارا بھی ہوتا، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ اپنے اوپر کسی ذمہ داری کو لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا اس کا کہنا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خود لی ہے لہذا ہم کو دردسری مول لینے کی کیا ضرورت ہے اللہ خود حفاظت کرلے گا، رسول کی بیویوں کو اتنے بہت سے لوگ اچھا کہنے والے ہیں اگر کچھ لوگ برا بھی کہدیں تو ان کی سیرت پر اثر پڑنے والا نہیں ہے، اسی طرح رسول کے صحابیوں کا معاملہ ہے کہ ان کو برا کہنے والے خود اپنا نقصان کرتے ہیں، اللہ ان سے سمجھے گا، قیامت کے دن اللہ کے سامنے ان کو جواب دہ ہونا پڑیگا، ہم سے کچھ سوال نہ ہوگا۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان "ترقی پسند مسلمانوں" کی پشت پناہی کے لئے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو اپنے کو قوم کا مقتدا کہتے ہیں، دین کا سمجھنے والا ظاہر کرتے ہیں اور اپنے کو اللہ کے رسول کا نائب اور ان کے دین کا امین کہتے نہیں تھکتے، اب ہم کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم ان "ترقی پسند" مسلمانوں کے چکر میں پڑ کر اپنے دین و مذہب کو برباد کر دینا گوارہ کرلیں گے؟؟

گرل فرینڈ

کیوں جاوید صاحب وہ کون صاحب تھے جو صبح صبح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آپ کے ساتھ اسٹیشن روڈ پر جا رہے تھے؟

میرا جاوید صاحب سے یہ سوال کوئی اعتراضاً نہ تھا، بلکہ محض یونہی سلسلۂ کلام شروع کرنے سے پہلے تھا، مگر جاوید صاحب پر اس کا معلوم نہیں کیا اثر ہوا کہ ان کی بھویں تننا شروع ہو گئیں، اور کھنچتے کھنچتے کمان کی طرح ہو گئیں، پہلے تو میں اسے ہنسی ہنسی میں ٹالتا رہا، مگر جب ان کے چہرے پر غصہ کی اسٹارٹنگ دیکھی تو مجبوراً سنجیدہ ہو گیا، حالانکہ سچ پوچھئے تو میرا دل سنجیدگی پر اس وقت قطعی تیار نہیں ہو رہا تھا کیونکہ پلان یہ تھا کہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد جاوید صاحب سے چائے کی فرمائش کرونگا، اور پھر مزے کے ساتھ ہم لوگ چائے پئیں گے اور گپیں لڑائینگے، مگر جاوید صاحب نے سارا پلان کباڑا کر کے رکھدیا، اور اپنے غصہ کو نشر کرتے ہوئے یوں فرمانا شروع کر دیا، دیکھو میاں اگر میں تم جیسے مٹھوسوں کو تھوڑی سی "لفٹ" دیدیتا ہوں۔ تو اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ تم اپنی حقیقت بھول کر پاجامے سے باہر نکلنے لگو، اپنی زبان کو لگام دیئے رہا کرو، اور آدمی

کا "موڈ" پہچاننے کا سلیقہ سیکھو، ان کی نصیحت تو میری خاک سمجھ میں آتی، البتہ ان کے تیکھے تیور اور کڑوی کسیلی باتوں نے میرے دماغی توازن کو بگاڑ دیا، خصوصاً اس وجہ سے اور بھی کہ مجھے اپنا جرم معلوم نہیں تھا میں نہیں جانتا تھا کہ میری کس بات سے جاوید صاحب اس قدر برافروختہ ہو گئے ہیں اور بلا وجہ میں بھی کسی کی سن نہیں سکتا، اگر کوئی اور ہوتا تو بات آگے بڑھ جاتی، کچھ میں کہتا کچھ وہ کہتا، وہ چیختا میں چلاتا، وہ دھمکی دیتا، اور میں دھمک دیتا، اور پھر جو ہوتا، اس کو تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں، مگر مشکل یہ تھی کہ یہ باتیں جاوید صاحب کی کہی ہوئی تھیں جن کی طرف سے دن بھر میں دو تین مرتبہ میری چائے کی باقاعدہ دعوت ہوتی ہے اور گھنٹہ دو گھنٹہ خوش گپیوں میں گزرتا ہے، میں نے اپنے سو کلومیٹر فی منٹ کے رفتار سے آئے ہوئے غصہ پر بریک لگایا، اگرچہ اس اچانک بریک کا اثر حلق پر ہوا، اور آواز میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی اور میں نے اپنی حلق کو صاف کرتے ہوئے نہایت پیار کے ساتھ ان سے پوچھا، ارے بھئی میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی کہ آپ مجھ سے اکھڑ گئے، کچھ وجہ بھی بتائیے گا، یا بس تلاوت تبرا شریف ہی کرتے رہیے گا۔

اماں کیا بکتے ہو "تلاوت تبرا شریف"، لاحول ولاقوۃ، عجیب خرافاتی آدمی ہو، واقعی تم کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے سلیم نے بیچ میں لقمہ دیا اور میں انکے اس دخل در معقولات پر جھنجھلا گیا، اور جاوید صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا، دیکھئے جناب! آپ مجھے مٹھوس اور از کار رفتہ کہتے ہیں، جبکہ سلیم جیسے بے خبر بھی موجود ہیں، (روئے سخن سلیم کیطرف پھیرتے ہوئے) ابھی حضرت آپ

کو کچھ خبر بھی ہے یہ بیسویں صدی ہے، کیا پیرس میں "سوئمنگ پول" پر مرد و عورت ایک ساتھ ننگے نہا سکتے ہیں، اور مرد و عورت بغیر نکاح کئے ہوئے لائسنس کے ذریعہ ازدواجی تعلقات قائم کر سکتے ہیں، یعنی کہ دوسرے لفظوں میں متعہ کر سکتے ہیں، مگر ہندوستان میں تلاوت تبرا شریف کی اجازت نہیں مل سکتی؟ پھر وہی بکواس! سلیم نے ذرا کڑک دار لہجہ میں کہا! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا بھیجہ سڑ گیا ہے اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئی ہیں، بھلا بتاؤ تو سہی، تبرا کے معنی ہیں گالی اور گالی بکنے کی بھی بھلا کوئی شریف آدمی اجازت مانگ سکتا ہے یا اسے اپنا حق بنا کر پیش کر سکتا ہے؟

میں نے کہا اسی لئے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ کبھی کبھی اخبار بھی پڑھ لیا کرو برادرم مطالعہ کی عادت ڈالو مطالعہ کی! تب ہی تمہارے دماغ کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ سکیں گی، اور جدید مسائل سے کچھ واقفیت حاصل ہو سکے گی، سنو! اپنے اسی بھارت دیش کے مشہور و معروف شہر لکھنؤ میں ایک نئی قوم دریافت ہوئی ہے جس نے تلاوت تبرا شریف کو مذہب و اخلاق اور شرافت و انسانیت کیلئے لازم قرار دیا ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ قوم ایسا عقیدہ رکھتی ہے بلکہ بر سر عام سڑکوں اور چوراہوں پر اپنے اس "پیدائشی اور فطری حق" کے استعمال کے لئے حکومت سے "رجسٹریشن" بھی مانگتی ہے، تاکہ دوسروں کی مقدس مذہبی شخصیات کو آزادی کے ساتھ برا کہا جا سکے، اور ان کو گالیاں دیکر جہنم کے فرسٹ کلاس میں رزرویشن کرایا جا سکے، اب سمجھے برخوردار "تلاوت تبرا شریف" کا راز! جاؤ گھر جا کر سو جاؤ، ورنہ سوچتے سوچتے بخار چڑھ جائے گا، یہ کہتے ہوئے میں نے سلیم کی

طرف سے منھ پھیر لیا،

سلیم نہ جانے کتنی دیر تک میرے اس "انکشاف" کے بارے میں سوچتا رہا، مجھے خبر نہیں، میں تو جاوید صاحب کی طرف متوجہ گیا، اور ان سے برہمی کی وجہ از سرِ نو دریافت کرنے لگا، اتنی دیر میں جاوید صاحب کا ٹمپریچر بھی نارمل ہو چکا تھا، اور "بھارت کی نئی دریافت" کے بارے میں میرے انکشاف سے وہ مجھ سے متاثر بھی ہو گئے تھے اور میرے علم و تحقیق سے بے حد مرعوب بھی، جس کا اظہار تو انھوں نے اپنی شان کے لائق نہ سمجھا، البتہ گفتگو کے لب و لہجہ میں کافی تبدیلی آگئی اور نارمل سے بھی تین سینٹی گریڈ نیچے اتر کر انھوں نے مجھ سے یوں گفتگو شروع کی، اماں کچھ بھی نہیں خفگی وفگی تو کیا۔ بات دراصل یوں تھی کہ وہ کوئی صاحب نہیں، بلکہ میری "گرل فرینڈ" ہیں جن کے ساتھ میں صبح جا رہا تھا، تمہارے اس طرح "کون صاحب" کہنے سے مجھے یہ خیال ہو گیا کہ شاید تم میری "گرل فرینڈ" کا مذاق اڑا رہے ہو اسی لئے کچھ الٹی سیدھی باتیں کہدیں، مگر ابھی تمہارے "تبرا" کے متعلق گفتگو سے تمہاری "روشن خیالی" کا علم ہو کر شرمندگی ہوتی، تم میری باتوں کا کچھ اثر نہ لینا۔

جاوید صاحب تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر میرے تفتیشی دماغ کے لئے "گرل فرینڈ" کا شوشہ چھوڑ دیا۔ میں کافی دیر تک اپنے دماغی سانچہ پر کس کر "گرل فرینڈ" کو الٹ پلٹ کر ہر زاویئے سے دیکھتا رہا، مگر جب زلف جاناں کی طرح مسئلہ الجھتا ہی چلا گیا تو میں نے جاوید صاحب سے مدد طلب کی، جاوید صاحب یہ بھلا یہ تو بتایئے سہی کہ یہ گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ میں اتنا تو سمجھ

گیا کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ دوست جو لڑکی ہو مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ لڑکی کی لڑکے سے باقاعدہ دوستی "کس نوعیت کی ہوتی ہے اور ان کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوتی ہے اور کہاں تک "احتیاط" ہوتی ہے آپ کے اس طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے سے میں واقعی انھیں "کوئی صاحب" ہی سمجھا تھا مگر اب تو معاملہ دوسرا ہو گیا ہے اس لئے اس کی تفصیل سے بھی آگاہ کیجئے۔ جاوید صاحب نے نہایت ہی مشفقانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا بس "دھری رہ گئی ساری قابلیت" اسی بل بوتے پر اپنے کو "مردم شناس" کہتے پھرتے ہو؟ میں نے فوراً جواباً عرض کیا، دیکھئے جاوید صاحب! اول تو میرا نام "میاں مردم شناس" خود اپنا رکھا ہوا نہیں ہے کہ اس کی تمام معنوی ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہوں یہ نام میرے ماموں جان کے بہنوئی صاحب نے رکھا ہے لہذا اس کی ذمہ داری ان کے سر ہے، دوسری بات یہ کہ یوں بھی میں مردم شناس ہوں، "عورتم شناس" نہیں، اور میری "عورتم شناس" کی ترکیب پر جاوید صاحب کے منھ سے بے اختیار ہنسی کی پھلجھڑی چھوٹ پڑی، ہا ہا۔ ہی ہی۔ ہو ہو۔ مختلف طریقوں سے کافی دیر ہنس لینے کے بعد وہ یوں گویا ہوئے،

"گرل فرینڈ" موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت ہے اس سے آپ کو سوسائٹی میں اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے آپ گرل فرینڈ سے ہر قسم کی بات کر سکتے ہیں بالکل بے تکلفی کے ساتھ، اگر آپ کی اور اس کی "خواہش" یعنی کہ پسند لڑ جائے تو شادی رچا لیجئے اور اگر نہیں تو "یونہی" ملتے جلتے رہئے، شادی کوئی ضروری نہیں ہے اب اس سے زیادہ تفصیل بیان کرنے کی میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں ہے تم خود کافی

سمجھ دار ہو، یہ کہتے کہتے ان کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی، اور میں اخلاقاً منھ چڑانے کے انداز میں مسکرا دیا، جاوید صاحب نے یہ خیال کر کے کہ میں مطمئن ہو گیا ہوں، دوسری باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا، اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا نہ جانے کب تک میں اسی مراقبے میں رہتا اگر جاوید صاحب مجھے جھنجھوڑ کر یہ نہ کہتے کہ چائے پیو گے؟ میں نے ان کو جواب دیئے بغیر قدم بازار کی طرف بڑھا دیئے، راستے بھر بظاہر تو میں سلیم اور جاوید صاحب سے گفتگو کر رہا تھا اور ان کی باتوں کا ہاں ہوں میں جواب بھی دے رہا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میری نگاہوں کو کسی چیز کی تلاش تھی جسے جاوید صاحب اور سلیم دونوں نے بھانپ لیا تھا، چائے کا آرڈر دینے کے بعد ہوٹل کی کرسیوں پر بیٹھتے بیٹھتے سلیم اور جاوید صاحب میں آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارہ ہو گیا، اور کرسی پر بیٹھتے ہی سلیم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا؛ ارے کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟ میں نے نہایت ہی فلسفیانہ انداز میں جواب دیا، بات یوں ہے کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ اتنی قلیل آمدنی شادی کی راہ میں روڑا بنی ہوئی ہے ابا جان کا کہنا ہے کہ جب تک تم باقاعدہ خود کفیل نہ ہو جاؤ گے میں تمہاری شادی نہیں کروں گا، تمہیں تو یاد ہی ہو گا کہ تمہاری سفارش پر ابا جان نے کس طرح تم کو آڑے ہاتھوں لیا تھا، اور میرے ساتھ ساتھ ہی تم کو بھی بےکار محض اور زمین کا بوجھ قرار دیکر "کام کا آدمی" بننے کی فہمائش کی تھی ان حالات میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ کوئی "گرل فرینڈ" بنا ڈالوں، اپنا دل بھی بہلا رہے گا اور بوجھ بھی نہیں پڑیگا اسی لئے ابھی راستے بھر دیکھتا ہوا آیا ہوں کہ اگر کوئی "شکل" "گرل فرینڈ" بنانے کے قابل نظر آجائے۔ تو نئی تہذیب زندہ باد کا نعرہ لگا کر بڑھا دوں ہاتھ، کہو کیسا رہیگا؟

گھاس تو نہیں کھا گئے ہو برخوردار! جاوید صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے نہایت ہی پروقار لہجہ میں ارشاد فرمانا شروع کیا۔ "پیارے جس پیسے کی وجہ سے تمہاری شادی نہیں ہو پا رہی ہے وہ پیسہ "گرل فرینڈ" کے لیے اور بھی ضروری ہے، تمہیں سمجھنا چاہیے کہ شادی کے بعد عورت میں ایثار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ روکھی سوکھی میں بھی ہنسی خوشی گذارہ کر لیتی ہے بیوی تقدیر پر شاکر ہو کر تمہاری خستہ حالی میں بھی تمہارا ساتھ دے سکتی ہے مگر "گرل فرینڈ" کے لیے بغیر ٹکے کے سوچنا بھی نہیں، یہ دوستی ہے دوستی! کچھ دوگے تو کچھ پاؤگے، ایسے ہی ہر شخص "گرل فرینڈ" پیدا کر لے تو بات ہی کیا رہ گئی یہ پیسے کا کھیل ہے اور پیسے کی اہمیت ہر دور میں تسلیم کی گئی ہے، لہٰذا اگر "گرل فرینڈ" کا شوق ہو تو پہلے جیب کو نوٹ دار کرو، اور پھر بسم اللہ"

جاوید صاحب کی اس لمبی چوڑی تقریر کا مجھ پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں، اندھیرے دل میں امید کی ہلکی سی کرن وہ بھی ختم ہو گئی، میری آرزوئیں پائمال ہو گئیں اور میرے خیالوں کا بالکل نیا نیا تعمیر شدہ محل چکنا چور ہو گیا، اور میرے منھ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس کے ساتھ نکل گیا۔

"گرل فرینڈ، تیرا کیا اعتبار۔۔"

خون اور دین کا فرق

ارے قلزم صاحب کہاں چل دیے؟ لمبے لمبے ڈگ بھر کر جاتے ہوئے قلزم صاحب کو ہانک لگا کر میں نے ٹوکا، مگر قلزم صاحب مست تھے بھلا وہ میری کہاں سنتے، مجبوراً مجھے کلیجے کا پورا زور لگا کر کہنا پڑا، "اجی حضت کریلا کھاتے جائیے" اتنا سنتے ہی قلزم صاحب کے منہ سے لعنت ملامت کا فوارہ پھوٹ پڑا، اور سڑک پر ٹھہر کر چاروں طرف نظریں گھما گھما کر دیکھنے لگے کہ کون ہے جس نے انہیں "چھیڑا"، ہے آخر نظریں مجھ سے چار ہوئیں، میں نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا. جواب سلام تو وہ خاک دیتے البتہ میری ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے جواب میں دانت کٹکٹاتے اور بڑھتے بلکہ جھپٹتے ہوئے بہت ہی غصیلی آواز میں کہنا شروع کیا: اے میاں چیاں کی دم، کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ مت کیا کرو، مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، آخر چاہتے کیا ہو؟ "میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ مگر آپ اس کے بغیر سنتے بھی تو نہیں ہیں، قلزم صاحب اس کے بعد کافی دیر تک ڈانٹتے اور پھٹکارتے رہے، اور میں ان کو بہلاتا چمکارتا رہا.

بات دراصل یوں ہے کہ قلزم صاحب کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ کریلے سے چڑھتے ہیں اور اس سے قطعی نفرت کرتے ہیں، اور اگر کوئی کریلے کا نام ان کے سامنے

لے لیتا ہے تو وہ مشتعل ہو جاتے ہیں مگر یہ چڑنا اور مشتعل ہونا بھی غالباً عبادت تقیہ کی ادائیگی کے لیے ہوتا ہے اور مقصد تقیہ کر کے ثواب عظیم حاصل کرنے کے سوا شاید کچھ اور نہیں ہوتا، کیونکہ معتبر ذرائع سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ ترکاریوں میں کریلا ہی سب سے زیادہ رغبت کے ساتھ تناول کرتے ہیں اور اکثر ان کے دسترخوان پر ان کی چیز موجود رہتی ہے جسے وہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں، بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو، ہم لوگ تو قلزم صاحب کے سامنے کریلے کا ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ وہ برہم ہوں، ہم خوشامد کریں، وہ بگڑیں اور ہم منائیں، اور بس! یار زندہ صحبت باقی! چنانچہ آج بھی حسب معمول قلزم صاحب بگڑ گئے اور ہم انھیں منانے لگے، پھر جب ہم ان مراسم سے فارغ ہوئے، تو میں نے قلزم صاحب سے پوچھا کہاں چل دیئے صبح صبح اور وہ بھی، اتنی جلدی میں؟ کہنے لگے تمھیں معلوم نہیں، رات دلاور صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا، اسی کی خبر کرنے ان کے کچھ اعزا کے یہاں جا رہا ہوں۔

اچھا کیا پروگرام ہے؟ میں نے سوال کیا، قلزم صاحب نے کہا کہ بس تھوڑی دیر بعد جنازہ غسلخانے لے جا کر غسالوں کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

اچھا تو رات دلاور صاحب کے یہاں چراغاں ہوا ہو گا؟ میں نے پوچھا۔ قلزم صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ تمہارے بھیجے میں دیمک لگ گئی ہے؟ کہیں کسی غمی کے موقع پر چراغاں ہوتا ہے؟ قلزم صاحب کا یہ جواب سن کر میرے دماغ کے سارے دریچے کھل گئے، اور یقیناً میری آنکھوں میں چمک بھی پیدا ہو گئی ہو گی، مگر قلزم جیسا ناقدرا اور گورده اسے کیا سمجھ سکتا تھا، بہرحال میں نے

ایک دوسرا سوال جڑ دیا۔ اچھا آپ یہ بتائیے کہ بینڈ باجے کے لئے آپ جائینگے یا میں جاؤں؟ کیونکہ محلہ داری کے ناطے میرا بھی کچھ فریضہ ہے، اس لئے دلاور صاحب کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

اور اب واقعی قلزم صاحب نے اپنی پھاڑ کھا جانے والی نظروں سے مجھے کچھ اس طرح گھورنا شروع کیا کہ میں نے ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں، اور کافی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی مجھ سے کچھ ایسی ہی غلطی سرزد ہو گئی ہے؟ مگر جب اپنی ضمیر کو پوری طرح مطمئن پایا، تو قلزم صاحب کی طرف نئے دم خم کے ساتھ متوجہ ہوتے ہوئے عرض کیا، اجی حضرت میں نے کون سی ایسی غلطی کر دی کہ آپ مجھے اس طرح گھورنے لگے جس طرح بے بس بلی اپنے شکار کو دور سے دیکھتی ہے؟ قلزم صاحب نے اپنی طرحدار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

برخوردار! مذاق ہر وقت اچھا نہیں لگتا، کسی کے گھر موت ہو گئی اور آپ کو ہنسی ٹھٹھا سوجھا ہے بھلا یہ بھی کوئی موقع ہے کہ چراغاں اور بینڈ باجے کی بات کی جائے؟ کیا غم کے موقع پر یہی سب کچھ ہوتا ہے اور کیا دنیا میں کہیں بھی اظہار غم درنج کی یہ صورت ہوتی ہے؟ پھر تم دلاور صاحب کے سلسلہ میں اس قسم کی خرافاتی باتیں کیوں بک رہے ہو؟ میں نے نہایت ہی مسمی صورت بنا کر بھاری آواز میں کہنا شروع کیا، قلزم صاحب میں قطعی سنجیدہ ہوں، اور آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں نے یہ سب کچھ مذاقاً نہیں کہا ہے، بلکہ حقیقتہً دریافت کیا ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کے یہاں ایسے موقع پر مذہبی حیثیت سے چراغاں اور باجا گاجا

اور یہ خیال میرے دل و دماغ میں اس لئے بسا کہ نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؓ سے آپ حضرات کو جو تعلق اور محبت ہے وہ ظاہر ہے، ان کے غم میں سال بھر آپ لوگ گھلتے رہتے ہیں، آگ کا ماتم، چھری کا ماتم، زنجیروں کا ماتم، تلواروں کا ماتم اور ہاتھ کا ماتم انھیں کے یاد میں ہوتا ہے۔ ان ہی کے نام پر کاغذ کے تعزیئے، لکڑی کے تعزیئے موم کے تعزیئے اور شیشے کے تعزیئے رکھے جاتے ہیں، اب اتنا سب کچھ ہونے پر بھی کیا آپ لوگوں کی محبت اور آپ کے تعلق کا کوئی اعتبار نہیں کریگا؟ نہیں کم از کم مجھے تو پورا یقین ہے کہ آپ لوگ غم حسین ہی میں پیدا ہوتے ہیں اسی غم میں بڑھتے پلتے ہیں اور اسی غم میں جان دیدیتے ہیں، تو پھر آپ لوگوں سے زیادہ غم شناس کون ہوگا؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ غم حسین میں ہر سال ۸ر اور ۹ر محرم کو امباڑے سجائے جاتے ہیں ان پر چراغاں ہوتا ہے اور دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ بلکہ اب تو ان کم بخت وہابیوں نے جب سے امین آباد والے جلسۂ سیرت کی طرف توجہ کردی ہے تب سے امام باڑوں کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہے اور لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ایک گیٹ امین آباد والے جلسے کا ان ساری روشنیوں کو نمٹا دے گا، تو اس وجہ سے باہر کے لوگوں کی توجہ بھی کم ہوگئی ہے اور شہر کے لوگوں کی بھی، ورنہ پہلے تو کافی دور دور سے لوگ غم حسین کے چراغاں کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ اور یہ چراغان آپ ہی لوگوں کے اہتمام میں ہوتا ہے اسی طرح علم کے بعض بعض جلوسوں میں غم مناتے کے لئے بینڈ باجوں کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے اس لئے چراغاں اور بینڈ باجے کو بھی میں غم حسین کی علامت سمجھنے لگا ہوں، ورنہ آپ لوگوں جیسے وفادار اور حسینؓ کے عاشق غم حسینؓ میں چراغاں نہ کرتے اور بینڈ باجے نہ بجواتے،

مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اظہار غم کے لئے یہی چیزیں جب میں دلاور صاحب کے والد کے غم میں کرنا چاہتا ہوں تو آپ کو اس میں کیوں مذاق اور دل لگی نظر آتی ہے، ؟

میری بات معقول تھی یا غیر معقول اس کا مجھے کوئی پتہ ہی نہ چل سکا، کیونکہ میری اتنی لمبی چوڑی بات سننے کے بعد قلزم صاحب نے ایک بہت ہی مختصر سی بات کہی اور پھر دوسری باتیں چھیڑ دیں، انھوں نے اس کی بھی خبر نہ لی کہ انکی بات کا مجھ پر کیا اثر ہوا، مجھے اطمینان ہوا یا نہیں ؟ البتہ مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ قلزم صاحب کے لئے یہ سوال کوئی نیا نہیں ہے ورنہ اتنی جلدی وہ بات کا رخ نہ موڑتے کہ مجھے ان کے جواب کے سلسلے میں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

قلزم صاحب نے جو جواب دیا تھا اسے آپ بھی سن لیجئے اور پھر اے ناظرین با تمکین آپ ہی کچھ فیصلہ کر کے بتائیے کہ اس جواب میں کون سا فلسفہ پوشیدہ ہے اور اس فلسفہ کا کیا نام رکھا جائے ؟ قلزم صاحب کا مختصر سا جواب یہ تھا۔

"یہ خون کی بات ہے اور وہ دین کی، دونوں میں فرق بھی تو ہے"

میر صاحب اور میں

میر صاحب کو میں بھلا چھیڑتا کیا؟ محلہ کے بزرگ ہونے کے ناطے عام احترام تو میں ان کا کرتا ہی ہوں، اس کے علاوہ میرا اور ان کا بزرگی و خوردی کا ایک رشتہ یہ بھی ہے کہ نانا جان مرحوم اور وہ ہمجولی کے ہیں اور دونوں میں بڑا یارانہ تھا، چائے خانے میں بیٹھنے کے بعد گفتگو کا سلسلہ کبھی بھی میں نے اس وقت تک ختم ہوتے نہیں دیکھا تھا جب تک ہوٹل مالک نے اپنے پرانے وقتوں کی یادگار، تپائیوں کو ان کی ہم سن میزوں پر رکھنے کے بعد تالا ہاتھ میں لے کر یہ نہیں کہا کہ اچھا بس باقی باتیں صبح کیجئے گا۔ رات بہت ہو گئی ہے، اب ہوٹل بند ہو گا، ہوٹل مالک کے اس آرڈر کے بعد نانا جان اور میر صاحب جدا ہوتے تھے، اور میں نے متعدد بار اس چیز کو شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا کہ گفتگو کے درمیان اس مداخلت کو ہر دو بزرگوں نے بڑی ناپسندیدہ نظروں دیکھا مگر مجبوری کے آگے سر جھکاتے اور باقی باتیں دوسری قسط میں کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تھے جیسے بھاگے ہوئے فوجی سپاہی کو پھر سے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہو، اور وہ حسرت بھری نظریں اپنے عزیزوں پر ڈال رہا ہو۔

آج بھی میر صاحب کے سامنے جب نانا جان مرحوم کا ذکر ہوتا ہے تو وہ اپنی

جگنو سی آنکھوں کو مٹکا مٹکا کر اور چہرے کے زاویے بدل بدل کر آنسو بہانے اور اپنے بے پناہ تعلق کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، سرد آہ بھرتے ہیں ان کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور پھر آخر میں ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کے نواسے سے ایک گرم چائے کی فرمائش کرتے ہیں۔

پھر بھلا اس قابل احترام تعلق کی موجودگی میں میں ان کو چھیڑتا کیا، وہ تو میں نے محض "بگڑے ہوئے حالات" پر تبصرہ کرنے کی غرض سے کہا تھا، کہ میر صاحب اگلی مرتبہ تو خوش عقیدہ اہل سنت حضرات نے بھی تعزیہ نہ رکھنے کا اعلان کیا ہے یہ تو بڑا غضب ہو گیا، میر صاحب جیسے پہلے سے ادھار کھائے بیٹھے تھے اتنا سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ اپنے منھ کے پان کی کرچوں اور ڈلی کے چھروں سے کپڑوں پر کامدانی بناتے ہوئے نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ کہنا شروع کیا کہ کیا مذاق کرتے ہو، امام عالی مقام کی روح تڑپ رہی ہوگی یہ کمبخت وہابی ان کو جنت میں بھی چین سے نہیں رہنے دینا چاہتے۔ ہائے بیچارے امام کی زندگی میں تو قدر کی نہیں، ان کو دھوکہ دیکر کوفہ بلایا گیا، اور پھر ان کو مع ان کے خاندان کے شہید کر دیا گیا یہی نہیں بلکہ شہادت کے بعد بھی ان کی یاد صحیح ڈھنگ پر نہیں منائی گئی، مجھے تو حیرت ہوتی ہے امام عالی مقام کے فدائی شیعوں پر کہ انھوں نے بھی عرصہ دراز تک نہ تعزیہ رکھا نہ مہندی اٹھائی نہ ضریح نکالی اور نہ ہی "تلاوت تبرا شریف" کے لیے جلوس نکالے، خدا بھلا کرے حضرت تیمور لنگ بادشاہ کا جنھوں نے امام عالی مقام کی صحیح قدر دانی کی، اور تعزیہ داری کی بدعت حسنہ کو ہندوستان میں رائج کر کے عزاداران حسین کیلئے دل بستگی کا سامان فراہم کیا، ورنہ اس سے پہلے سنی تو خیر وہابی تھے ہی شیعہ بھی اگر یزید

نہیں تو آدھے وہابی ضرور تھے کیونکہ تعزیہ داری جیسے اہم مذہبی جز کو چھوڑ کر کوئی سنی یہ صحیح العقیدہ سنی کہلانے کا مستحق نہیں۔ اور شیعہ تو خیر اپنا نام شیعہ رکھ ہی نہیں سکتا، خیر بہرحال اگر صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے حضرت تیمور کے بعد سے اب تک شیعہ تو خیر تعزیہ بناتے اور رکھتے اور اسے ایک اہم دینی فریضہ شمار کر کے اس کی حفاظت کرتے ہی ہیں خوش عقیدہ اہل سنت حضرات بھی اب تک اس کار ثواب میں انکے برابر کے شریک رہے لیکن یہ وہابڑے ہمیشہ ان کو ورغلانے کی کوششیں کرتے رہے، مگر ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی، افسوس کہ اس مرتبہ یہ اپنی چال میں کامیاب ہو گئے اور خوش عقیدہ اہل سنت حضرات نے بھی تعزیہ نہ رکھنے کا اعلان کر کے محرم کا سارا مزہ کرکرا کر دیا، اتنے بڑے حادثہ پر تم کو دل لگی سوجھی ہے، اور میرے زخموں کو کرید رہے ہو،

مگر میر صاحب! آپ کی یہ بات کچھ سمجھ میں آئی نہیں، کیونکہ وہابی اگر وہ سنت تیموری، کو ناجائز اور حرام قرار دینے کے لئے اپنی طرف سے کچھ کہتے، تب تو آپ کا یہ کہنا صحیح ہوتا، مگر وہ تو خوش عقیدہ اہل سنت حضرات کے سامنے ان عالموں کے فتوے پیش کر رہے ہیں جن کو نہ صرف وہ لوگ مانتے بلکہ ان کے ہر ہر قول و فعل پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے فتووں کی خلاف ورزی کرنے کو عذاب الٰہی مول لینے کے برابر خیال کرتے ہیں، پھر موجودہ علمائے اہل سنت بھی ان فتووں کو صحیح قرار دیکر ان کی حمایت کر رہے ہیں، کانپور میں تو ایسے کئی اشتہار شائع ہوئے ہیں جن میں تعزیہ داری کو خوش عقیدہ اہل سنت کے لئے بھی قطعی حرام قرار

دیا گیا ہے اور ان میں نئے سے لیکر پرانے تک درجنوں خوش عقیدہ علمائے اہل سنت کے فتوؤں کی نقلیں بھی چھاپی گئی ہیں، میں نے میر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میر صاحب نے بڑے سوز و گداز کے ساتھ کہنا شروع کیا، برخوردار! رونا تو اسی کا ہے کہ گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ ہم کو خوب اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ خوش عقیدہ اہل سنت حضرات کے یہاں بھی مذہبی حیثیت سے تعزیہ رکھنا اور اس کا بنانا حتی کہ اس کو دیکھنا حرام ہے، اس بات کو ان کے پرانے عالموں نے بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے، مگر چونکہ عام طور پر خوش عقیدہ اہل سنت حضرات معجون جہالت کا استعمال ضروری خیال کرتے ہیں اور ان کے موجودہ عالموں سے ہم نے ساز باز کر کے مزید جہالت کی گولیاں کھلوا دی تھیں، اس لئے اب تک یہ گاڑی چلتی رہی، پھر بھی ان وہابیوں کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے ہم کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ جس دن یہ پردۂ جہالت اٹھا اسی دن ہمارا شیش محل چکنا چور ہو جائیگا، آخر کار یہ بے دین وہابی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور جہالت کے دبیز پردے ہٹا کر صحیح العقیدہ اہل سنت کے بڑے بڑے عالموں کے وہ فتوے ان کو دکھا دیے جو تعزیہ داری کے حرام ہونے کے ہیں، یہ حرکت اتنے شاطرانہ انداز میں کی گئی کہ موجودہ بڑے بڑے خوش عقیدہ اہلسنت علماء بھی ان وہابیوں کے چکر میں آ گئے اور انھوں نے بھی ان فتوؤں کو صحیح قرار دیتے ہوئے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو تعزیہ داری میں نہ شریک ہونے کی ہدایت کر دی معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے

کہ بیچارے چند چھٹ بھئیے قسم کے خوش عقیدہ مولویوں کے سنبھالے سنبھلنے والا نہیں ہے جو آج بھی حق نمک ادا کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں مگر ان کو بھی دیر یا سویرا اپنے بڑوں کی بات ماننا ہی پڑے گی، ورنہ خوش عقیدگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

میں نے میر صاحب سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے نہایت ہی فلسفیانہ انداز میں کہا کہ میر صاحب اگر اہل سنت تعزیہ داری چھوڑ رہے ہیں تو چھوڑ دیں آپ کے بیان کے مطابق ان کے مذہب کی رو سے یہ فعل حرام ہے۔ آپ اس "تیموری سنت" کو زندہ رکھیئے، ان کے رکھنے نہ رکھنے سے آپ پر کیا اثر پڑتا ہے، آپ بلا وجہ اتنا پریشان ہیں۔

میری اصل بات پر تو میر صاحب نے غور کیا نہیں، البتہ "تیموری سنت" پر سخت قسم کا اعتراض کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے، یہ تم تیموری سنت تیموری سنت کیا بار بار کہہ رہے ہو مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اندر بھی کسی بد باطن وہابی کی روح حلول کر گئی ہے، ورنہ اس قسم کی بکواس ہرگز نہ کرتے۔

میں نے پوری اطاعت کا ثبوت دیتے ہوئے جواباً عرض کیا کہ قبلہ آپ ہی نے تو ابھی فرمایا ہے کہ تعزیہ سب سے پہلے ہندوستان میں تیمور لنگ نے بنوایا ہے اسی لئے تمام بادشاہوں میں خصوصیت کے ساتھ آپ نے انھیں حضرت کے خطاب سے نوازا۔ اب اگر تعزیہ داری کو میں "سنت تیموری" کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے۔؟

میر صاحب کا پارہ اب پوری طرح چڑھ گیا کیونکہ وہ اب قطعی لاجواب

ہو چکے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں، غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے نہایت ہی کڑک دار آواز میں فرمایا۔ پنجتن پاک کی قسم اگر اپنے مرحوم دوست کا خیال نہ ہوتا، تو تجھے کتوں سے اسی وقت نچوا دیتا، تیری یہ جرأت کہ قرآن و حدیث سے ثابت شدہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی فریضہ کو تو "سنت تیموری" قرار دے رہا ہے، پھیلا لو اس دنیا میں جس قدر رجا ہو وہابیت، پھیلا لو خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، کل روز محشر جب امام مظلوم بارگاہ خداوندی میں اپنا کٹا ہوا سر لے کر حاضر ہونگے اور...... اتنا کہتے کہتے میر صاحب کا گلا رندھ گیا اور سارے بدن پر تھرتھری طاری ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو اپنا ہی کوئی جرم یاد آگیا ہو، وہ آگے کچھ نہیں بول سکے بس ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنے لگے کچھ اس انداز میں کہ اس بات کا جائزہ لے رہے ہوں کہ میں نے ان کی چوری پکڑ تو نہیں لی

میں نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا، میر صاحب! یقیناً امام مظلوم کی شہادت وہ دردناک حادثہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، مگر مظلوم حسینؓ کے ساتھ ہماری محبت کا ثبوت یہ ہوگا کہ ہم ان کے کردار کو اپنائیں حسینؓ نے حق کی سربلندی کی خاطر اپنی جان دیدی۔ مگر خلاف حق بات کے سامنے جھکنا گوارہ نہیں کیا، ان کی یادگار یہ ہے کہ ہم ان کے اس کردار کو اپنائیں اور حق کے پرچم کو بلند کرنے کی کوشش میں جان کی بھی بازی لگانا پڑے تو لگا دیں، تاکہ حسینیت زندہ رہ سکے، ان کی یادگار یہ تو کبھی بھی نہیں ہو سکتی کہ ان کی قبر کی نقلیں بنا کر ہم اسے لئے لئے پھریں، اس کے آگے روئیں، اور منتیں مانیں اور اسے لے جا کر دفن کر دیں، بس!

حسینؓ کے کردار کو اپنانے والا ہی حسینؓ سے محبت کے دعوے میں سچّا ہو سکتا ہے۔ حسینؓ کے نام پر من مانی باتیں کرنے والا محبت کا دعویٰ کرنے میں قطعی سچا نہیں ہے۔

میری اور میر صاحب کی گفتگو تو یہیں پر ختم ہو گئی، مگر ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میری گفتگو کے آخری جملوں پر میر صاحب کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اب اس کے بارے میں تو صحیح طور پر میر صاحب ہی بتا سکیں گے کہ وہ آنسو ندامت کے تھے یا روایتی غم حسین کے۔ البتہ ہم کو اگلے سال کے محرم کا انتظار ہے کہ دیکھیں اب میر صاحب کی تعزیہ کے سلسلے میں کیا پالیسی رہتی ہے۔!!

مرزا آسمان قدر کا تقیہ

مرزا آسمان قدر کو میں نے ایک شریف اور سنجیدہ آدمی سمجھ کر بات چیت تو شروع کر دی، مگر اب ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا، کیونکہ ان کی داستان زلف دراز لفت ختم ہونے ہی میں نہیں آتی تھی، اور ادھر مجھے قارئین البدر کا خیال آرہا تھا، کہ اگر آئینہ نہ دکھایا تو قارئین کے روٹھ جانے کا اندیشہ ہے، کئی دفعہ ان کی ایک سو بیس کلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے جاری تقریر کو روکنے کے لئے میں نے بریک لگایا، مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکا، جس طرح سردی اپنے شباب پر تھی اسی طرح ان کی تقریر بھی اپنے شباب پر تھی، آخر انھوں نے آپ کے لاچار درمیاں مردم شناس،، کا وہ سارا قیمتی وقت لے لیا، جس میں وہ آپ کو آئینہ دکھانے کے قابل ہو سکتا تھا، اس لئے اب آج کوئی بات نہ پیش کی جا سکے گی، بلکہ مرزا آسمان قدر کی گفتگو یا دوسرے لفظوں میں تقریر کے مختلف حصے قارئین البدر کی نذر کئے جا رہے ہیں۔ اگر بوریت ہو تو مرزا آسمان قدر کی روح کو اس کا ثواب پہنچا دیں، اور اگر کچھ مسرت ہو تو مرزا صاحب کے ساتھ ساتھ اپنے اس خادم کو نہ بھولیں، کہ جس نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ مرزا صاحب کی تقریر کو اپنے دماغ کے خزانہ میں محفوظ کر کے کاغذ پر بکھیرا۔

بات کچھ یوں تھی کہ مرزا صاحب بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گولڈن کمانی کا چشمہ لگائے ہاتھ میں اپنی روایتی چھڑی لئے اور گرم چیسٹر زیب تن کئے چہل قدمی کے لئے نکلے، ادھر سے قضار کا مارا میں بھی نکل پڑا، علیک سلیک کے بعد مرزا صاحب کو اخلاقاً میں نے چائے کی پیش کش کی۔ جسے انھوں نے حسب دستور "خورد نوازی" کا ثبوت دیتے ہوئے قبول کر لیا، اور ہم دونوں ہوٹل کی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگے، وقت گذاری کے خیال سے میں نے مرزا صاحب سے کہا، کہئے مرزا صاحب کیا ہو رہا ہے شیعہ سنی مسئلہ میں؟ .... بس اتنا پوچھنا تھا کہ مرزا صاحب کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور سلسلہ تقریر کا یوں شروع کیا۔

میاں کیا پوچھتے ہو، یہ ایک داستان ہے، ایک راز سربستہ ہے، جس کا انکشاف کروں تو بسکی، اور نہ کروں تو پریشانی، گڑ بھرا ہنسیا نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے، بس یوں سمجھ لو کہ اب جلوس مدح صحابہؓ تو لکھنؤ میں نکل ہی جائے گا۔

جی! میں نے حیرت سے منھ پھاڑتے ہوئے مرزا صاحب کو دیکھا، مرزا صاحب یہ آپ کہہ رہے ہیں؟

ہاں میاں ایسا ہی ہے، میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں، تم جانتے ہو کہ میری عادت غلط بیانی کی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے لغو باتوں سے دلچسپی ہے۔

بیشک بیشک میں نے نہایت ہی سعادت مندی سے کہا، تو پھر اتنا سمجھ لو مرزا صاحب نے سلسلۂ کلام دراز کرتے ہوئے کہا، کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو شہری اور مذہبی حقوق ملے ہوئے ہیں، شیعہ اپنا جلوس نکال سکتے ہیں اور نکالتے

ہیں، ہندو اپنا جلوس نکال سکتے ہیں اور نکالتے ہیں، سکھ اپنا جلوس نکال سکتے ہیں اور نکالتے ہیں، تو پھر سنّی اپنا جلوس کیوں نہیں نکال سکتے ؟، شاہی دور تو اب رہا نہیں کہ سنیوں کو دبالیا جائے، اب تو سنّی بھی اپنا جلوس نکال سکتے ہیں، اور نکالیں گے، اور اس کے ذمہ دار ہم لوگ ہی زیادہ ہیں، کیونکہ ہم نے سوچا کچھ، ہوا کچھ،

وہ کیسے مرزا صاحب؟ میں نے مرزا صاحب کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا!

وہ اس طرح کہ شیعہ لکھنؤ میں اقلیت در اقلیت ہیں، مگر پھر بھی سب سے زیادہ جلوس انھیں کے اٹھتے ہیں، حکومت کا سب سے زیادہ پیسہ انھیں کے انتظام پر خرچ ہوتا ہے پھر بھی ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی، اور انھوں نے اپنی یہ بھی ذمہ داری سمجھ لی کہ اس وقت تک مزہ ہی کیا جب تک سنیوں کو ان کے شہری حقوق سے محروم نہ کیا جائے، چنانچہ ہمارے قابل فخر جوانوں نے سنیوں کی مسجدوں میں تراویح کی حالت میں ڈھیلے بازی کر کے ان کو تراویح سے روکنے کی کوشش کی، ان کی دوکانوں اور گھروں میں آگ لگا کر ان کی معیشت کو برباد کرنے کا کارنامہ انجام دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنی بھی اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے میدان میں آگئے، اور اب وہ دبنے پر آمادہ نہیں ہیں، اور اپنا پورا پورا حق وصول کرنے کو کہتے ہیں، میں پھٹی پھٹی نظروں سے مرزا آسمان قدر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ آنکھ بند کئے کچھ اس طرح تقریر میں منہمک تھے، جیسے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی کسی دلی تڑپ کا اظہار کر رہے ہوں۔

اتنے میں مرزا صاحب نے اچانک آنکھیں کھولیں، جیسے وہ خواب میں چونک پڑے ہوں، معلوم نہیں کیا سوچ کر اپنی تقریر کا رخ پھیرتے ہوئے انھوں نے کہنا

شروع کیا، مگر سنی بھی تو ضدی ہیں، اگر جلوس نہ نکالیں تو کیا حرج ہے، کوئی انکا مذہب تو ختم نہیں ہوا جا رہا ہے، بھائی ان کے مذہب میں تو اصل چیز نیک عمل ہے نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ ادا کریں، سچ بولیں، دوسروں سے بہتر سلوک کریں، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر مہربانی کریں، کیا اتنی بہت سی چیزیں مذہب پر عمل کرنے کے لیئے کافی نہیں ہیں؟ —— کاش کہ سنیوں کو ہی ترس آجاتا، اور وہ سیدزادوں پر رحم کرکے ان کا مذہب بچا لیتے۔!!

میں نے مرزا صاحب کو ٹوکتے ہوئے کہا! مرزا صاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، یہ ساری چیزیں تو آپ کے یہاں بھی مذہب ہی کا حصہ ہیں، پھر ان پر آپ کیوں نہیں عمل کرتے، آخر علموں، تعزیوں اور جلوسوں پر آپ حضرات کو کیوں اصرار ہے؟

مرزا صاحب نے آس پاس کا جائزہ لینے اور چاروں طرف نظریں گھما کر اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ ان کی بات کوئی سن نہیں رہا ہے، سرگوشی کے لہجہ میں مجھ سے کہا، تم بھی برخوردار بعض وقت بچکانہ باتیں کرنے لگتے ہو، یہ تو صحیح ہے کہ کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہیں، مگر کیا تم نے آج تک ہمارے کسی ذاکر یا مجتہد کو ان موضوعات پر تقریر کرتے سنا ہے؟ میں نے جلدی جلدی مرزا صاحب کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیئے اپنے حافظہ کے فائلوں کی ورق گردانی شروع کی، مگر کسی پرانی سے پرانی فائل میں بھی اس قسم کا کوئی حادثہ نظر نہیں آیا، مایوسی کے ساتھ مرزا صاحب کی طرف دیکھنے لگا، مرزا صاحب میرا سوکھا منھ دیکھ کر پہلے مسکرائے، اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ یوں گویا ہوئے، عزیزم میری عمر تم سے بہت زیادہ ہے، اور پھر میں تو مذہب شیعہ سے ہی تعلق رکھتا ہوں، میں

تم کو پورے اطمینان کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ذاکرین کا موضوع گفتگو ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے "فضائل ومسائل اہل بیت" اور ہمارے سامعین کے دو کام ہیں، رونا اور داد دینا، رو کر جنت خریدی جاتی ہے اور داد دے کر ذاکر کو خوش کیا جاتا ہے۔

تو پھر یوں سمجھ لو کہ ہمارے مذہب کا تو دارومدار ہی ان چیزوں پر ہے، اگر علم نہ نکلیں، اگر تعزیئے نہ اٹھیں، اگر مجلس نہ برپا ہوں تو شیعیت دنیا سے ختم ہو جائے گی۔

تو مرزا صاحب مثل مشہور ہے کہ شیشے کے محلوں میں رہنے والے کبھی دوسروں کے گھر پر ڈھیلا نہیں پھینکتے، کیونکہ دوسروں کے ایک ہی ڈھیلے سے ان کا پورا شیش محل چکنا چور ہو جائیگا، اگر آپ کے لئے یہ تمام باتیں اسی قدر ضروری تھیں، تو پھر سنیوں کے ربیع الاول کے جلوس کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اس کے نقصانات آپ کے ذہن میں نہیں تھے؟ میں نے عرض کیا۔

میرے عزیز! مرزا صاحب نے مجھے بہلاتے ہوئے کہا۔ یہ سب خاندانی بچوں کی حرکت تھی، ہم لوگوں کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا، اب اگر اس میں دس بیس جانیں چلی گئیں یا لاکھ دو لاکھ کا نقصان ہو گیا تو اس کا اتنا بھی کیا برا ماننا، ارے بھئی تم تو جانتے ہی ہو کہ اپنے ملک میں افراط زر بہت ہے اور اس پر قابو حاصل کرنا ضروری ہے اس طرح کچھ پیسہ ہی ختم ہو گیا۔ ایسے ہی تم جانتے ہو کہ آبادی کس طرح بے تحاشا بڑھ رہی ہے، پچھلی حکومت نے تو اس پر قابو پانے کے لئے جبری نس بندی اسکیم بھی چلائی تھی، اگر حکومت کے کام کو بچوں نے کچھ ہلکا کر دیا، تو کوئی

اتنا بڑا قصور تو نہیں کیا، پھر تم جانتے ہو کہ اس بہانے سے ان غریبوں کے ہاتھ کچھ پیسہ آ گیا جس سے کچھ دن گھر کا چولہا جلا ہوگا، ورنہ اس بے روزگاری کے دور میں روزگار کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والے ہی کیا کم پریشان ہیں، پھر ان کا کیا پوچھنا جو سال بھر غم حسین میں اپنے کو رونے کے لیے وقف کر چکے ہوں.

مرزا صاحب کی منطق اب مجھ سے کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی، اس لئے میں نے اٹھتے ہوئے مرزا صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی، مگر مرزا صاحب نے بہت زور دے کر روکتے ہوئے ایک خاص بات بتانے کی لئے مجھے روک لیا، خواہی نہ خواہی مرزا صاحب کی دل داری کی خاطر مجھے رکنا پڑا، اور فوراً خاص بات سنانے کا تقاضہ کیا، مرزا صاحب فرمانے لگے، برخوردار اسی بات کو سنانے کے لئے تو میں تمہارے پاس آیا تھا، وہ اتنی معمولی بات نہیں ہے کہ اس طرح سنا دوں، پہلے چائے کا آرڈر دو، تاکہ کچھ گرمی آ سے، بلائے ناگہانی یعنی مرزا آسمان قدر کو ٹالنے کے لئے میں نے جلدی سے چائے کا آرڈر دے دیا،

چائے کی چسکیوں کے درمیان مرزا صاحب نے جو بات بتائی وہ کیا تھی؟ اس کو میں کس طرح بیان کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا، بس سیدھے سادے لفظوں میں ہی ان کی بات دہرائے دیتا ہوں، مرزا صاحب بولے، عزیزم اور کچھ نہیں کہنا ہے بس بات اتنی سی ہے کہ میں نے ابھی جو کچھ باتیں کی ہیں اس میں سے وہ حصہ جو میرے خلاف پڑے اس کو تقیہ سمجھ لینا، کیونکہ وہ میں نے اسی کار ثواب کی نیت سے کہا تھا۔

جی مرزا صاحب کیا فرمایا آپ نے ؟ میں نے بہت ہی گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا

مرزا صاحب نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ. تبسم آمیز لہجے میں فرمایا

ہاں میرے عزیز معاملہ ایسا ہی تھا ہے اور یہ میرا مذہبی حق ہے کہ جو بات میرے خلاف پڑے میں اسے تقیہ پر محمول کر دوں. تقیہ کی نہ صرف مجھے اجازت ہے بلکہ اس میں مجھے اپنے مذہب کی رو سے ثواب بھی ملتا ہے۔

اے ناظرین با تمکین! آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی، جی میں تو یہی آیا تھا کہ مرزا آسمان قدر کو ایک فرمائشی قسم کا تھپیڑ رسید کر کے یہ کہوں کہ پھر ایسی صورت میں میرے مذہب کا یہ حکم ہے، مگر کیا کروں، فضائیں یوں ہی کشیدگی پائی جاتی ہے، یاروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ عبادت تقیہ کی ادائیگی میں اس نے روڑا اٹکایا ہے اس لئے اس کی گردن قلم کی جائے، ورنہ ہم تحریک چلائیں گے، یہی سوچ کر چپ تو ہو گیا، مگر "آئینہ" نہ دکھا سکنے کا افسوس ہے، اور غالباً آپ میری معذوری کو معذوری سمجھ بھی رہے ہونگے۔ خیر ؏

جو زندہ رہے تو ملاقات ہوگی

امام حرم یہ کیا کیا؟

کیوں لڈن صاحب کیا بات ہے خیریت تو ہے؟ سدا بہار لڈن صاحب کو میں نے اداس اور افسردہ دیکھ کر سوال کیا۔ لڈن صاحب میرے اس سوال پر چونک پڑے اور جیسے اپنے دل کا حال چھپاتے ہوئے مجھ سے کہا، کچھ نہیں، بس یونہی طبیعت ذرا بھاری ہے، میں نے بھی زیادہ کرید نا مناسب نہ سمجھ کر بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، اور لڈن صاحب کے پسندیدہ موضوع، تھیٹر اور ریٹنگ پر گفتگو شروع ہو گئی، زمین و آسمان کے قلابے ملنے لگے، لڈن صاحب اپنے کمالات بیان کرتے رہے اور ان فنون لطیفہ کی ناقدری اور موجودہ وقت میں ان کے حال زار پر کافی دیر تک اظہار خیال کرتے رہے مجھے تائید کرنا تھی سو کرتا رہا، کیونکہ مجھے لڈن صاحب کا موڈ صحیح کرنا تھا اور اس کی یہی ایک تدبیر تھی۔

جب لڈن صاحب کی گاڑی صحیح طور پر پٹری پر آگئی تو میں نے بات ٹالتے ہوئے گفتگو کا رخ ڈالی گنج کیطرف موڑ دیا، میں نے کہا لڈن صاحب! ایک امام حرم کے آنے پر کتنی چہل پہل ہو گئی تھی، ٹریفک جام ہو گئی، سڑکوں پر تل دھرنے کی

جگہ نہیں رہی، اور جمعہ کی نماز میں کتنا زبردست مجمع تھا، اتنا آدمی کہاں سے پھٹ پڑا؟ میرا خیال یہ ہے کہ ندوہ والوں کو بھی اتنی بڑی جماعت کی امید نہ رہی ہوگی میں نے دیکھا کہ لڈن صاحب کے چہرے پر شگفتگی کی جگہ اداسی نے پھر بسیرا ڈال لیا، وہ منھ کھولے، دیدے پھاڑے ہونقوں کی طرح مجھے یک ٹحت گھورے جارہے تھے انھوں نے میری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لی، ہاں، نا، میں کچھ جواب بھی نہیں دیا بس وہ مجھے خاموشی کے ساتھ گھورے ہی جارہے تھے، آخر جب ان سے صبر نہ ہو سکا تو بے تابانہ انداز میں بولے، بھئی بس ہو بھی چکا مبالغہ، اب اتنا بھی کیا بڑھانا کہ زمین کو آسمان کر دیا جائے، حرم کے امام تھے اس لئے لوگوں کو فطری طور پر کچھ دلچسپی ہونا ہی چاہیئے تھی، اب تم اسی کا ذکر لے کر بیٹھ گئے، کیا کوئی دوسرا موضوع تمہاری گفتگو کے لئے نہیں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لڈن صاحب کو اس ذکر سے کیوں اس قدر بیزاری ہوئی، آخر امام حرم نے ان کا کیا بگاڑا ہے، جب کہ لکھنؤ کا ہر باشندہ امام حرم کے زبردست استقبال پر شاداں و فرحاں نظر آرہا ہے اور ہر زبان پر یہی چرچا ہے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی گر جائے، اس کے اعمال کتنے ہی خراب ہو جائیں، مگر اس کو اپنے مرکز اصلی سے آج بھی تعلق ہے اور یہ اسی تعلق کا نتیجہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں نے امام حرم کے پیچھے نماز ادا کی، دور دور سے بسوں ریلوں اور دوسرے ذریعوں سے لکھنؤ پہنچے، کڑکڑاتی سردی کے باوجود ہوائی اڈہ پہنچ کر ان کا والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا، اور صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار نظر آئے، مسلمان تو مسلمان سکھ بھائیوں نے بھی امام حرم کے استقبال میں گیٹ بنائے، اور ان کا زبردست استقبال کر کے ان کے مقام

عالی کا اعتراف کیا۔

میں سوچنے لگا یا اللہ! یہ لڈن صاحب کو کیا ہو گیا ہے، کیا انھوں نے گھاس کھائی ہے کہ ان کو لکھنؤ کے اس خوش نصیب دن کے بیان سے بھی الجھن ہو رہی ہے، بیچارے امام حرم نے ان کا کیا بگاڑا ہے کہ یہ ان سے اس قدر ناراض ہیں۔

آخر میں نے لڈن صاحب کو ٹوکا، لڈن صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ حرم الٰہی کے امام آپ کی سرزمین پر تشریف لائے اور آپ نے ان کا شایان شان استقبال کیا، کعبہ مکرمہ کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے والے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں، آج لکھنؤ کے ہر گلی کوچہ میں یہی تذکرہ ہو رہا ہے آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی سننا چاہتے ہیں کیا امام حرم سے آپ کو کچھ شکایت ہے، ، کچھ بتائیے تو سہی۔

لڈن صاحب نے میری بات بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنی، پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا، عزیزم میں بھی خوش تھا، تمہاری ہی طرح بلکہ تم سے بھی زیادہ، مگر میری ساری خوشی خاک میں مل گئی میں نے بھی سوچا تھا کہ حرم کے امام آرہے ہیں، جو ہر کلمہ گو کے نزدیک متبرک و مقدس شخصیت کے حامل ہیں، اسی لئے میں بھی ان کو ہوائی اڈہ لینے گیا تھا، ان کے نورانی چہرہ کو دیکھ کر میں جتنا متاثر ہوا تھا، اس کو بیان نہیں کر سکتا، ہم نے ان سے بڑی امیدیں باندھی تھیں، مگر مگر...... یہ کہتے کہتے لڈن صاحب کا گلا رندھ گیا، اور ان آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔

الہٰی خیر! پھر کیا ہوا لڈن صاحب کچھ بتایئے تو سہی، پھر کس چیز نے آپ کو مایوس کیا، کیونکر آپ کا جوش وخروش ختم ہو گیا، آپ کی آرزوؤں اور امیدوں کو کس نے پائمال کیا؟ مجھے واقعی لڈن صاحب کے اس طرح بلک بلک کر رو دینے سے ان پر بڑا ترس آنے لگا۔

لڈن صاحب نے بڑے سوز وگداز کے ساتھ کہنا شروع کیا کہ اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ شیعہ سنی جھگڑا صرف ہمارے ہی ملک کے مقدر میں لکھا ہے ورنہ اور کہیں تو یہ قضیے ہوتے ہی نہیں ہیں اسی لئے ہم کو امام حرم سے بڑی امیدیں تھیں، اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ حالات سے تو واقف ہونگے نہیں، ان سے اپنی بات نہ کہی جائے، بلکہ خالی سنیوں کے جلوس مدح صحابہؓ کا مسئلہ پیش کر کے ان کی رائے لے لی جائے، تصویر کا ایک رخ سامنے ہو گا، فیصلہ ظاہر ہے کہ ہمارے حق میں ہو گا،

اسی وجہ سے ہمارے اخباروں نے بھی بڑے زور وشور کے ساتھ لکھا کہ "امام حرم سے فتویٰ لے لیا جائے" یعنی جلوس مدح صحابہؓ کے سلسلہ میں ان سے دریافت کیا جائے، وہ جیسا کہیں ویسا ہی سنی کریں، اس میں ہماری ایک چال تھی، وہ یہ کہ اگر وہ جلوس مدح صحابہؓ کی موافقت کریں۔ تو ہم کہدیں گے کہ یہ بھی تو سنی ہی ہیں، یہ تو اپنی کہیں گے ہی، ان کا کہنا ماننا ہم پر فرض نہیں ہے، یہ کوئی ہمارے عالم ہیں؟ اور اگر انھوں نے پورے مسئلہ پر غور وفکر کئے اور مقامی حالات کا جائزہ لئے بغیر ان کے ناجائز ہونے کو کہہ دیا، تو ہم کو بھی پورا موقع مل جائیگا سنیوں کو بدنام کرنے کا، ہم حکومت کے سامنے بھی یہ بات

رکھدیں گے کہ دیکھئے ان کے اتنے بڑے پیشوا کا کہنا ہے کہ جلوس مدح صحابہؓ ناجائز ہے، عوام میں یہ پروپیگنڈہ کریں گے کہ امام حرم کا کہنا مانو، ان کے فتویٰ پر عمل کرو، ان کی بات پر کان دھرو، ان کا کہنا ہے کہ جلوس مدح صحابہ کی ضرورت نہیں ہے، اور تم بے ضرورت چیز پر اصرار کر رہے ہو۔

سنی ہمارے اس پروپیگنڈہ سے ضرور متاثر ہونگے، اور ہمارا کام بن جائے گا، مگر افسوس کہ امام حرم نے تو وہ کیا، جس کی ان سے قطعی امید نہ تھی، انھوں نے کھلم کھلا دس بیس ہزار نہیں بلکہ لاکھوں کے مجمع میں یہ کہدیا، کہ "ہم اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے، کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویدار ہو، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو، اور صحابہ کرامؓ کی عظمت اور ان کی بزرگی کا قائل نہ ہو، گویا امام حرم کے نزدیک صحابہ کرامؓ کو ماننا بھی ایمان و اسلام کے لئے ضروری ہے اور وہ شخص اپنے کو مسلمان کہنے میں جھوٹا ہے، جو صحابہ کرامؓ کو نہ مانتا ہو۔

کتنی بڑی بات کہی ہے امام حرم نے! یہ تو بالکل وہی بات ہے جو لکھنؤ کے وہابڑے کہا کرتے ہیں، ابھی پچھلے دنوں نومبر ۷۸ء کے شمارے میں تمہارے "البدر" میں مولانا عبدالحلیم فاروقی کا جو انٹرویو چھپا تھا اس میں انھوں نے جو بات کہی تھی اس بات میں اور امام حرم کی اس بات میں کیا فرق ہے؟ اب تم خود ہی سوچو ہم کو تکلیف کیسے نہ ہو، ہم نے تو امام حرم پر اتنا بھروسہ کیا، کہ ان سے فتویٰ لینے کی بات کہہ دی، اگر ہم کو ان پر اعتماد نہ ہوتا، تو ہم اتنی بڑی بات زبان سے کیسے نکالتے، مگر وہاں فتویٰ لینے کی نوبت بھی نہیں آنے پائی کہ امام حرم نے پہلے ہی وہابیوں کے مطلب کی بات کہہ دی، اب ہم کیا منہ لے کر

سنیوں سے بات کریں گے، اور کیوں کر یہ دعویٰ کریں کہ سارا عالم اسلام ہمارے ساتھ ہے جب کہ امام حرم نے جو بات کہی اس کے حساب سے ہم اپنے کو مسلمان کہہ ہی نہیں سکتے، کیونکہ صحابہؓ سے ہم بغض رکھنا تو ہمارا بنیادی عقیدہ ہے، اگر یہی نہ ہو تو ہمارے مذہب کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑے گی

بات واقعی بالکل صحیح ہے، آپ کی خفگی حق بجانب ہے، میں نے کہا،

لڈن صاحب بولے وہ سب تو صحیح ہے، آپ اب یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں، تم اگرچہ وہابی عقیدہ کے آدمی ہو، مگر تمہاری دوستی پر مجھے مکمل اعتماد ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارا مشورہ بڑی سوجھ بوجھ کا ہوتا ہے اس لئے تم ہی رائے دو کہ اب ہم کیا کریں، ؟

لڈن صاحب کے اس سوال پر کچھ دیر تک میں غور کرتا رہا، آخر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی، میں نے کہا، لڈن صاحب آپ ایسا کیجئے کہ آئندہ سے ہر ۲۰ صفر کو امام حرم کا عشرہ منائیں، کیونکہ یہی وہ تاریخ ہے جس میں امام حرم نے سرزمین لکھنؤ پر آکر آپ لوگوں کی دل آزاری کی ہے، اور بھئی یہ سعودی لوگ تو ہمیشہ اعتماد کیا، ارے،، شاہ سعود کا عشرہ،، بھی تو انہیں کے مظالم کے خلاف رہ گیا ہے کہ آئندہ سے آپ امام حرم کا بھی عشرہ منائیں، اور اس میں کچھ اس قسم کے ماتمی جملے پڑھیں،

ہائے امام حرم - یہ تم نے کیا کیا، صحابہؓ کو ماننا جزاء ایمان ہی شیعوں کے لئے تو یہ بڑا امتحان ہے، ہائے امام حرم،

لڈن صاحب کے مردہ کھیتوں پر جیسے پانی کا چھینٹا پڑ گیا ان کے اداس

اور غمگین چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انھوں نے بے ساختہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیا، اور کپکپاتی آواز میں کہا عزیزم مجھے تمہاری دوستی پر بڑا ناز ہے، اسی وجہ سے تو باوجود سخت مذہبی اختلاف کے میں تم سے دوستی ترک نہیں کرتا ہوں، قسم ہے پنجتن اور میں تمہارے قیمتی مشورہ دل سے مجھے قدم قدم پر فائدہ پہونچا ہے اور میں تمہارے جیسا عقل مند آدمی پا کر فخر کرتا ہوں، تمہاری بتائی ہوئی یہ تدبیر سو فیصدی صحیح ہے، اور اس مسئلہ کا واحد حل یہی ہے لہذا آئندہ سال سے ایک عشرہ کا اور اضافہ، اور وہ ہوگا امام حرم کا عشرہ۔

ابھی لڈن صاحب سے میں اتنی ہی داد وصول کر پایا تھا کہ ایڈیٹر،، البدر،، کا تقاضہ یاد آگیا لہذا لڈن صاحب سے اجازت لے کر واپس اپنے گھر کی طرف چلدیا، راستے بھر لڈن صاحب امام حرم اور ان کے عشرہ کے تکون کے باری میں سوچ سوچ کر زیر لب مسکراتا رہا پھر اچانک ہی میرے منہ سے نکل گیا،، امام حرم یہ کیا کیا؟

روداد ایک کانفرنس کی

حبیب صاحب سے میرے بچپن کے تعلقات ہیں۔ انھوں نے اور میں نے ایک ساتھ مکتب میں پڑھا تھا۔ ایک ساتھ سبق یاد کیا تھا ایک ساتھ کھیلے تھے اور پھر سبق نہ سنانے پر ایسا بھی ہوا کہ دونوں ایک ساتھ پٹے تھے ایک ساتھ تختی لکھی تھی اور پھر تختی پر سیاہی پوتنے میں ہونٹوں اور ناک پر بھی سیاہی ملی تھی غرضیکہ تقریباً پانچ سال تک مکتب کی ساری سرگرمیاں میں میں اور وہ شریک رہے۔ یوں تو مکتب کے اور بھی بہت سے ساتھی تھے مگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جو مناسبت تھی وہ نہ مجھے کسی دوسرے ساتھی سے تھی نہ ہی حبیب صاحب کو! یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں میں میل ہی رہتا تھا اور اگر کبھی کسی بات پر خفگی کی نوبت آجاتی اور اس کے نتیجہ میں کٹی ہو جاتی تو وہ بھی بہت مختصر وقفہ کے لئے ہوتی کسی نہ کسی طرح معاملہ کو رفع دفع کرنے یا کرانے کی کوشش ہوتی اور پھر میل ہو جاتا۔ مگر تعلقات کی یہ شکل بس مکتب ہی برقرار رہی کیونکہ اس وقت تک ہم دونوں کی راہیں ایک تھیں، مزاج ایک تھے، مقصد ایک تھا اور ساری دلچسپیاں بھی یکساں نوعیت کی تھیں اس کے بعد راہیں بدل گئیں

اور ہمارا اور ان کا مکتب کا ساتھ بھی چھوٹ گیا ایسا نہیں کہ اس کے بعد تعلقات ختم ہو گئے ہوں تعلقات تو خدا کا شکر تھا کہ اب تک ہیں مگر عمر کی ترقی اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انداز فکر میں تبدیلی ہوتی گئی۔ ایسا بھی نہیں کہ حبیب صاحب نے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد مجھے فراموش کر دیا ہو یا مجھ سے ملنا عار سمجھتے ہو وہ اب بھی مجھ سے جب ملتے ہیں تو کافی کافی دیر تک بچپن کی باتیں یاد کر کے لوگ لطف اندوز ہوتے مگر ہاں حبیب صاحب میں اتنی تبدیلی ضرور ہو گئی ہے کہ اب وہ میرا کسی سے تعارف کراتے وقت مجھے اپنا کلاس فیلو" کہتے ہیں رفیق درس یا سبق کا ساتھی نہیں وہ مکتب اسلامیہ نہیں" اسلامک اسکول" کے الفاظ استعمال کرتے تھے اس طرح مکتب کے سیدھے سادھے مگر خوب مار مار کر تعلیم و تربیت دینے والے مولوی صاحب کو اب وہ "ٹیچر" کے نام سے یاد کرتے ہیں جبکہ معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ رفیق درس" کلاس فیلو" نہ بنے۔ مکتب مکتب اسلامیہ رہے۔ اسلامک اسکول" اسے نہ کہا جائے مولوی صاحب پر نہ جانے کیوں مجھے لفظ کو میں ان کی قابل احترام ہستی کی ترجمانی کے لئے ناکافی خیال کرتا ہوں میرا اور ان کا یہ اختلاف حرف نہیں ایک محدود نہیں بلکہ یہ ایک نظریاتی اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ آج کے جدید اور ترقی یافتہ دور میں پرانے نظام اور پرانے خیالات کی گنجائش نہیں ہے لہذا جہاں تک ہو سکے پرانی چیزوں کو نئے سانچوں میں ڈھال دیا جائے یا بالفاظ دیگر ان کو ماڈرن بنا لیا جائے جبکہ اس

سلسلے میں میرا اپنا خیال شروع سے یہی رہا کہ نام کی تبدیلی اس ذہنی غلامی تبدیل نہیں ہو جایا کرتیں ہاں نام کی تبدیلی اس ذہنی غلامی کی ضرور نشادہی کر دیتی ہے جس سے متاثر ہو کر آدمی حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے ورنہ کیا وجہ کہ مکتب میں بیٹھ کر مولوی صاحب سے پڑھنے کا حال بیان کرنے میں عار ہو اور اسکول میں ٹیچر سے پڑھنے کو بیان کرنا قابل فخر؟

اس نظریاتی اختلاف کے باوجود حبیب صاحب اور میرے درمیان جس قسم کے تعلقات تھے اس کے پیش نظر یہ خبر بہر حال میرے لئے مسرت کی تھی کہ حبیب صاحب جلد ہی ایک آل انڈیا کانفرنس کر رہے ہیں جس میں اس بات پر بحث ہوگی کہ مذہب کو زندگی کے کن کن معاملات میں مداخلت کا حق ہے اور کن کن معاملات میں نہیں ہے

کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں، بڑے زور شور اور بڑی گرما گرمی کے ساتھ بہت سے ٹاہران تعلیم" اور سیاسی لیڈران "کی شرکت کی منظوری آگئی میں اور حبیب صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی اس بات سے بہت خوش تھا کہ کانفرنس کامیاب ہوگی۔

آخر خدا خدا کر کے کانفرنس کی مقررہ تاریخ آگئی، زبردست پبلسٹی اور تگ و دو کے نتیجہ میں کانفرنس ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی "ماہران تعلیم" اور سیاسی لیڈران" بڑی تعداد میں پہونچ چکے تھے حبیب صاحب نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا کہ "ماڈرن علماء" کو کافی تعداد میں بلایا جایا چنانچہ شخصی فرنچ کٹ داڑھی والے "ماڈرن عالم" بھی خاصی تعداد

میں نظر آرہے تھے جن میں کے اکثر کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور چہرے کی اتار چڑھاؤ سے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ گویا اس کانفرنس کے ہیرو کم از کم خود اپنی نظر میں وہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں بھی عربی بولنے کی کوشش میں مصروف تھے اب یہ جیب صاحب کی محبت کیلئے یا موقع ناشناسی کہ ان کا مجھ سے اصرار تھا کہ اس کانفرنس میں تم کو بھی خیالات کا اظہار کرنا ہے پہلے تو میں نے بہت عذر معذرت گیا مگر آخران کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور ان کی پیشکش کو قبول کرنا پڑا

تقریروں کا سلسلہ شروع ایک "ماہر تعلیم" نے اپنی تقریر میں کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا،، آج کے اس ترقی یافتہ دور میں قوم کے ہونہار بچوں کو صرف دینی تعلیم دلانا اور حدیث و قرآن کے چکر میں ساری عمر ڈالے رکھنا کچھ مناسب بات نہیں ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ صنعتی تعلیم بھی مدرسوں میں دی جائے اور چھوٹے پیمانے پر اچی بنانے جوتے بنانے، موزے بنیائن بنانے کی تعلیم دی جائے تاکہ عربی مدرسوں کے طلباء دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی روزی روٹی کے لیئے کسی کے محتاج نہ رہیں"۔ مجمع سے ایک آواز ابھری،، پھر کیوں نہ انھیں صنعتوں پر بچوں کو شروع سے لگا دیا جائے مولانا جوتے والے کو اپنی قینچی سے کب فرصت ملے گی جو وہ دین کی خدمت کر سکیں گے،،

اناؤنسر نے سنی کرتے ہوئے ملک کے ایک "ہمدرد اور مصلح قوم" سیاسی لیڈر کو "شمع خراشی" کی دعوت دی۔۔ اناؤنسر لیڈر صاحب کا نام پکارنے کے بعد دیر تک ان کی مدح و ستائش کرتا رہا، ان کے قابل فخر" سیاسی سماجی

اور مذہبی کارناموں پر روشنی ڈالتا رہا جس کا مقصد بظاہر یہی سمجھ میں آیا
کہ اس طرح کچھ وقت گذر جائے اور وہ ٹائمس تک آجائیں لیڈر صاحب اٹھیں
اور آکر کھڑے ہوئے تو ان کی پینٹ کچھ ایسی تھی کہ ان کا توند آگے تھا اور وہ
خود اس کے پیچھے ، مجمع نے ان کو دیکھ کر تالیاں بجائیں معلوم نہیں یہ تالیاں
کیسی تھیں؟ ان کے استقبال میں یا ان کے ہنگم اور بے ڈول جسم کو دیکھ
کر! بہر حال انھوں نے اپنی تقریر میں خالص بھارتی انداز میں فرمایا مذہب
اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق
نہیں ہے اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ،، سیاسی معاملات میں مذہب کی
مداخلت کسی طرح نہ ہو تقریر وہ کچھ اس جوش و خروش کے ساتھ کر
رہے تھے کہ مجمع سے ابھری اس آواز پر بھی کان نہیں دھرا کہ ،، اور مذہبی
معاملات میں سیاست کو دخل دینے کی اجازت کیسے کرے؟،،

نیتا جی تقریر کرتے رہے منچلے نوجوان ہوٹنگ کرتے رہے سنجیدہ
لوگ اس بے وقت کی راگنی اور اپنے وقت کی اضاعت پر مضطربانہ کروٹیں
بدلتے رہے اور عین اس مرحلہ پر کہ مجمع اپنی بوریت کو مٹانے کے لیے
اٹھ کر چل دیئے نیتا جی نے اپنی تقریر ان جملوں پر ختم کی تو میرے بھائی بات
اتنی سی تھی کہ مذہب آپ کی پرسنل زندگی کی چیز ہے اور سیاست کا تعلق
پورے ملک سے ہے آپ اپنے گھر پہونچیں اور اپنے گھر والوں کے پاس
اٹھیں بیٹھیں تو آپ ہندو ہیں مسلمان ہیں سکھ ہیں عیسائی ہیں شیعہ ہیں وغیرہ
وغیرہ مگر جب آپ پبلک پلیٹ فارم پر آئیں تو اس میں سے کچھ نہیں صرف

انسان ہیں"

لیڈر صاحب اپنی تقریر ختم کر کے چلے گئے، مگر اپنے سننے والوں کا موڈ خراب کر گئے، جس مجمع نے تالیا بجا کر ان کا استقبال کیا تھا، اسی نے اترے ہوئے چہروں اور اوبے ہوئے دل کے ساتھ ان کو رخصت کر دیا۔ اناؤنسر نے مجمع کی بوریت کا اندازہ لگا لیا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ اگر یہی کیفیت کچھ دیر اور باقی رہ گئی تو مجمع اکھڑ جائے گا جیب صاحب بھی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے اور کسی سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے

اناؤنسر نے اپنی جھولی کا جائزہ لیکر سب سے اچھا مال نکالا اور اسے مجمع کے سامنے پیش کرتے ہوں یوں گویا ہوا "اب آپ کے سامنے میں ایک ایسی شخصیت کو پیش کر رہا ہوں جس کے خیالات یقیناً آپ کو متاثر کریں گے کیوں کہ ملک اور بیرون ملک میں گھوم پھر کر تجربات انھوں نے حاصل کئے ہیں، وہ یقیناً بڑے قیمتی ہیں میری مراد ہے مولانا ...... سے جو عرصہ پانچ سال تک از ہر یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور عصری تقاضوں سے پوری بھی طرح واقف ہیں۔ مجمع کو ایک مرتبہ پھر آس بندھی، میرے بھی کان کھڑے ہوئے خدا ہی خیر کرے مصر پلٹ مولانا تشریف لا رہے ہیں"

عرش اعظم بھی کانپ جاتا ہے:۔ مولوی جب گناہ کرتا ہے اکڑی گردن ترچھی نظروں اور تنی ہوئی بھوؤں کے ساتھ مولانا تشریف لائے جیب صاحب کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانفرنس کی کامیابی کا دارومدار حضرت مولانا ہی پہ ہے مولانا نے تقریر شروع کی "ماہر تعلیم" اور لیڈر

صاحب،، کے خیالات کی مکمل تائید کرتے ہوگے "ماڈرن اسلام،، کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کئے اور فرمایا پرانے خیال کے لوگ بس نماز روزہ، لباس اور وضع قطع پر ہی زور دیا کرتے ہیں عصری تقاضوں سے واقف نہیں ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس میں اتحاد ہو اور سب مل کر دین کی تبلیغ کریں ہمارے شہر میں شیعہ سنی کا قضیہ کافی پرانا ہو چکا ہے یہ سب ڈھکوسلا ہے شیعہ سنی ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں دونوں کا کلمہ ایک ہے دونوں کا خدا ایک رسول ایک، قرآن ایک، عقیدۂ آخرت ایک پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم آپس میں متحد نہ ہوجائیں ہمارا اختلاف مذہبی نہیں ہے سیاسی ہے ہم کو کچھ مفاد پرست لڑار ہے ہیں ورنہ ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے اور میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مذہبی طور پر کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے ابھی "مولانا،، یہیں تک پائے تھے کہ مجمع بھر گیا کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ سب بوگس ہے کوئی کہہ رہا تھا اب برداشت نہیں ہوگا کسی نے کہا جہالت ہے، کسی کی آواز آئی،...... یہ کانفرنس نہیں سیاسی بازیگری ہے غرضیکہ جتنے منھ اتنی باتیں! کانفرنس ناکامی پر ختم ہورہی تھی، مجمع اکھڑ چکا تھا جیب صاحب کا چہرہ لٹک گیا منھ دھواں دھواں ہورہا تھا، آوازہ کستے اور ریلتے ہوئے مجمع کو وہ بے چارگی سے دیکھ رہے تھے کانفرنس کے،، ہیرو،، کا یہ انجام بد دیکھکر ان کا خون پانی ہورہا تھا، اپنی امیدوں کے شیش محل کو زمین بوس ہوتے دیکھکر ان کی آنکھوں سے بے اختیاری طور پر آنسو چھلک پڑے

حبیب صاحب کچھ بھی سہی ان کے خیالات سے مجھے اتفاق نہ سہی مگر بہر حال وہ میرے دوست تھے، ان کی بے قراری میرے برداشت سے باہر

ہو گئی اناؤنسر ہکا بکا بیٹھا تھا آگے کے لئے نہ تو اس کے پاس کوئی پروگرام اور نہ ہی اس کی جھولی میں کوئی ،، عمدہ مال ،، تھا جسے پیش کر کے وہ مجمع پر قابو پا سکتا میں نے اناؤنسر کے اعلان کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ کر مائک سنبھال لیا اور مجمع کو ایک بات سن لینے کی درخواست پر رکنے کی فہمائش کی کچھ لوگ آگے جا چکے تھے وہ بھلا کہاں سننے والے تھے کچھ قریب کے لوگوں نے سنا اور پلٹ کر واپس آئے " کچھ بہت زیادہ " صابر ،، قسم کے لوگ ابھی اپنی اپنی جگہوں پر سے اٹھے ہی نہ تھے ، میں نے حلق کا پورا زور صرف کرتے ہوئے مجمع سے رکنے کی اپیل برابر جاری رکھی ، رکو رکو کی آوازیں بلند ہوئیں ، شور و غوغا دھیرے دھیرے کچھ کم ہونا شروع ہوا کچھ لوگ واپس آ گئے ، ایک کونے سے آواز آئی ،، کہیئے صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جو کچھ رہی سہی کسر ہو آپ پوری کر دیں ،، ، میں نے اس ،، پھبتی پر کان نہ دھر کر اپنی بات سادہ طریقہ پر کہدی ،، بھائیو ! آپ کے سامنے ابھی جن خیالات کا اظہار کیا گیا مجھے بھی اس سے قطعی اتفاق نہیں ہے ، میں زبردست ،، ماہر تعلیم ،، نہ سہی ، میں ،، قوم کے غم میں ڈنر کھانے والا لیڈر ،، نہ سہی ، اور میں ،، مصرپلیٹ عالم ،، بھی نہ سہی مگر میں اس ملک کا ایک باشندہ ضرور ہوں اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اس پر مسرت ہے کہ میں بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہوں اس لئے میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ابھی ابھی مقررین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہ ملک کے حق میں کوئی مفید بات کہی جا سکتی ہے اور نہ ہی مذہب کی خدمت کا اسے نام دیا جا سکتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم گھر کی تنہائی سے لیکر دنیا کی ہما ہمی تک ہر ہر مرحلہ ہر مسلمان

ہیں اور ہم کو ہر وقت اپنے مذہب کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہے اور اس
کی ہم کو اجازت ہے ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہم گھر میں مسلمان ہوں اور باہر مسب
غیربت ہے ،، والا معاملہ ہو اسی طرح ہمارا مذہب حق ہے اور اگر اس میں باطل کی
آمیزش کی کوشش کی جائیگی تو اسے الگ کرنا ہمارا فرض ہے مذہب تعلیمات
کے سلسلہ میں جو اختلافات ہیں انکو سیاسی اختلافات نام دینا بجائے خود ،، منفی
سیاست ،، اور حصول شہرت ،، کی اوچھی تدبیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے احدیث و
قرآن کی تعلیم کو ،، چکر ،، قرار دینے والے کچھ بھی ہوں مگر ،، ماہر تعلیم ،، نہیں ہو سکتے
کیونکہ جو لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن
وحدیث میں کامیاب زندگی گذارنے کا پورا نصب العین بتایا گیا ہے صنعت
وحرفت علم واخلاق، سیاست و تجارت غرضیکہ تمام چیزوں کی قرآن وحدیث
میں تعلیم موجود ہے پھر کیا مسلمان کو قرآن وحدیث سے بہتر زندگی گذارنے
کے اصول کوئی دوسرا بتا سکتا ہے نہیں ہرگز نہیں ! بس مجھے اتنی ہی بات
کہنی تھی مجھے امید ہے کہ آپلوگوں ابھی مطمعن ہو گئے ہونگے اور آپ کے دل میں
حبیب صاحب کی طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی بات ختم ہوگئی مجمع مطمئن ہو گیا
لوگوں کے چہروں پر واقعی مسرت کی لہریں دوڑ گئیں حبیب صاحب کی طرف سے لوگوں کے دل
صاف ہو گئے مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ حبیب صاحب کا دل میری طرف سے صاف ہی نہیں کیونکہ
حبیب صاحب میری گفتگو کے دوران ہی غائب ہو گئے تھے معلوم نہیں کیوں ؟ کانفرنس کی
ناکامی کے اندیشہ سے یا میری باتوں سے عاجز آکر بہرحال میں نے حبیب صاحب کے ساتھ اپنے
خیال کے مطابق ہمدردی ہی کی ہے مگر اب دیکھئے حبیب صاحب ملاقات پر کن تاثرات کا
اظہار کرتے ہیں ویسے سننے میں تو آرہا ہے کہ اب حبیب صاحب سے اس شہر

ہیں ملاقات ہی نہ ہو سکے گی وہ بمبئی گئے ہیں تاکہ وہاں کانفرنس کر سکیں کیونکہ لکھنؤ کی زمین ان کی کانفرنسوں کیلئے کچھ سازگار ثابت نہیں ہوئی،،

مولوی کی غلطی

دو قسم کے لوگوں سے مل کر نہ جانے کیوں مجھے بے انتہا مسرت ہوتی ہے ان سے گفتگو کرنے اور ان کے ساتھ سر ماری کرنے میں عجیب قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے وہ لذت جسکے بیان سے قلم عاجز ہے ایک وہ لوگ جو مولوی کو دنیا کا سب سے ناکارہ آدمی قرار دے کر اس پر طنز و تعریض کرتے ہیں اس کی ہجو کو عین ایمان تصور کرتے ہیں اور اس کے ناکردہ ..... گناہوں کو بڑے فخر کے ساتھ گنواتے ہیں دنیا کی ہر تباہی و بربادی کا اسے ذمہ دار قرار دیتے ہیں جب بات آگے بڑھتی ہے تو ان کی زبان بھی اپنے جوہر دکھانے لگتی ہے نکمی اور ناکارہ کے بعد سالے حرامخور کی نوبت آتی ہے اور پھر اسی رفتار سے مزید تہذیب کا مظاہرہ ہونے لگتا ہے؛

دوسرے وہ لوگ جو مولوی کو نہایت ہی مجہول ٹائم باڈ اور از کار رفتہ شخصیت کرار دے کر اس پر بظاہر ترس کھاتے ہیں اور اسے اپنے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کیلئے مبلغ دو روپیہ فی بچہ کے حساب سے ٹیوشن عطا کر دیتے ہیں رات کی بچی ہوئی گوشت ترکاری مولوی سے سوارت کرانا کار ثواب خیال کرتے ہیں

مولوی صاحب کے بیٹھنے کیلئے باقاعدہ طور پر کھجور کی چٹائی یا شکر کا بورا منگواتے ہیں، اور اس سلسلے میں خرچ کی ہوئی رقم کو آخرت کیلئے فکس ڈپازٹ خیال کرتے ہیں۔

آپ حیرت زدہ ہو کر ممکن ہے کہ سوال کریں کہ ان لوگوں سے مل کر تو تم کو کوفت ہونا چاہیئے پھر مسرت کیوں ہوتی ہے تو میں آپ کو بتاؤں کہ میری مسرت کا کیا راز ہے ۔ دراصل بات یوں ہے کہ اس قسم کے لوگ جب گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور مولوی کے ٹاپک پر اپنی بات چیت شروع کرتے ہیں تو ان کے چہرے پر جو اطمینان وسکون، ان کے لب ولہجہ میں جو اعتماد ویقین اور ان کے انداز گفتگو میں جو استدلالی قوت ہوتی ہے اسے کوئی اور چاہے جو کچھ سمجھے مگر میں اسے عارضی چمک دمک سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا مجھے یقین ہوتا ہے کہ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد مجھ سے گفتگو کے دوران ان کی یہ ساری خصوصیات ان کا ساتھ چھوڑ دیں گی یہ ایک ملمع ہے جو اتر جائے گا، یہ تلاوت تبرا شریف کریں گے میں ان کو سمجھاؤں گا میری زیر لب مسکراہٹ جلتے پر پٹرول کا کام کرے گی اور یہ خالص تبرائی زبان میں مولوی کی مادر پدر پننے لگیں گے اور میں آس پاس بیٹھے لوگوں کو ان کی اس محبوبانہ ادا کی طرف متوجہ کردوں گا لوگ ملامت کریں گے اور یہ جھنجھلا کر منہ موڑ لیں گے اور پھر آخر تک مجھ سے کوئی بات چیت نہیں کریں گے اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہے گا اور آس پاس بیٹھے لوگوں کی طرف سے بے ٹکٹ ڈرامہ دکھانے پر جو داد وتحسین مجھے ملے گی وہ گھاتے میں، ان حالات کے تسلسل کے ساتھ وقوع پذیر ہونے کا

مجھے اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا آپ کو صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح کے آنے کا ہوتا ہے

خوش نصیبی سے حال ہی میں ایک سفر کے دوران ایک ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی جسے مولوی کے سلسلے میں دونوں قسم کے تجربات تھے ایسی جامع الصفات شخصیتیں کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی ہیں، دونوں قسم کے تجربات انھیں بیک وقت نہیں حاصل ہوئے تھے بلکہ ان کے خود اپنے ہی بعد کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہوا کہ پہلے وہ مولوی پر ترس کھاتے تھے مگر اس کے نکارہ پن سے عاجز آکر اب اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں

مجھے ان بابو جی سے ملاقات کا شرف اس طرح حاصل ہوا کہ گاڑی کے ذریعہ نسبتاً خالی ڈبہ میں جب میں داخل ہوا تو ایک سیٹ کے کونے پر کھڑکی کے قریب اسوٹڈ بوٹڈ اور آج کل کی زبان میں بالکل فٹ "صاحب بہادر" بیٹھے نظر آئے جو مفکرانہ انداز میں ایک اخبار کے مطالعہ میں منہمک تھے ان کے قریب ہی خالی جگہ پاکر میں بیٹھ گیا تھوڑی دیر تک تو وہ مجھے اپنی آنکھوں پر چڑھے چشمے کے گوشوں سے دیکھتے رہے پھر ذرا اکڑ خشن لہجہ میں یوں لب کشا ہوئے، کہاں جانا ہے آپ کو؟ حیا گھاٹ تک میں نے مختصر سا جواب دیا اور پھر اخلاقاً ان سے پوچھا آپ کہاں تک تشریف لے جائیں گے؟ آپ سے آگے انھوں نے مجسٹریٹی تیور کے ساتھ جواب دیا اور پھر اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے، گاڑی نے سیٹی دی اور ایک جھٹکے کے ساتھ چل

پڑی، گاڑی کے چلنے سے شاید صاحب بہادر کے گدگدی پیدا ہوئی انھوں نے اخبار کو ایک طرف رکھتے ہوئے نہایت ہی دلبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھسے کھیلنے کے ارادہ سے پوچھا "مولوی صاحب کیا کرنے جارہے ہیں آپ؟"، آپ نے مجھے مولوی صاحب کیوں کہا، میں نے سوال کے جواب میں سوال کھڑا کردیا۔

آپ کے لباس آپ کی ٹوپی آپکی داڑھی کیوجہ سے انھوں نے چبا چبا کر جواب دیا میں نے پوچھا تو پھر سرسید احمد خاں کے بارے میں آپکی کیا رائے یہ ساری صفات تو انمیں بھی تھیں کیا آپ انھیں مولوی کہنا برداشت کریں گے؟ سرسید کا نام آتے ہی تقدس اور جلال کا نور ان کے چہرے پر نمایاں ہوا اور میرے سوال کا جواب دیئے بغیر ایکمرتبہ پھر اخبار اٹھا کر اس کے مطالعہ کیطرف متوجہ ہو گئے میں نے پھر سفر کاٹنے کیلئے اپنے بیگ سے کتاب باصد جواب، جوہر قرآن نکالی اور اسکے ورق گردانی کرنے لگا اچانک صاحب بہادر کے دل میں پھر سرسری پیدا ہوئی اور میری طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے فرمایا آپ مولوی کے نام سے چڑھتے تو ٹھیک ہی ہے اور اخبار کی ایک خبر پر انگلی رکھتے ہوئے فرمایا دیکھئے پاکستان کے فلاں مولوی صاحب کو کہ انھوں نے فلاں لیڈر کے ساتھ کیسی غداری کی حالانکہ یہ وہی لیڈر ہے جسنے ان کو آدمی بنادیا ورنہ انکو کون پوچھتا تھا میں نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے ہی جواب دیا، بھائی یہ غیر ملکی سیاست کی چیز ہے اسے وہیں کے لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں یا پھر آپ جیسے عالمی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے حضرات میں کوئی سیاسی آدمی نہیں اسلئے اس سلسلے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا

انھوں نے نہایت فخر کے ساتھ بازی اپنے ہاتھ آتے دیکھکر جلہ چست کیا ہاں مولوی کو تو بس اپنے کھانے پینے سے مطلب انکو دنیا کے دکھ درد سے کیا واسطہ،

میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور صاحب بہادر کو اپنی زیر مطالعہ کتا سے زیادہ دل چسپ پاکر فوراً کتاب بند کردی اور ان کی طرف متوجہ ہوگیا اور انسے کسی مولوی کو زخمی سمجھکر ہمدردانہ طریقہ پر سوال کیا آخر کیا بات ہے مولویوں سے کیوں اسقدر ناراض ہیں وہ جیسے اسی سوال کے منتظر بیٹھے تھے، اتنا سنتے ہی ساری شوخی اور مسکراہٹ رفوچکر ہوگئی اور نہایت ہی خونخوار لہجہ میں اپنی داستان سنانا شروع کی، مولوی قوم کے سلسلہ میں میرا بڑا تلخ تجربہ ہے یہ بڑی نمک حرام اور کاہل ہے میرے گھر کے قریب ایک مکتب ہے، جسمیں ایک مولوی صاحب قرآن شریف وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں میں نے بھی اس میں اپنے بچوں کو داخل کیا اور ہر طرح مولوی صاحب خیال کیا مگر تین سال تک مکتب میں پڑھنے کے باوجود بچوں کو کچھ نہیں آیا بڑا مجبوراً مجھے وہاں سے ہٹا کر دوسرے پرائمری اسکول میں بچوں کو داخل کرنا پڑا مولوی تین سال تک ان بچوں کی زندگی سے کھیلتا رہا نہ جانے قوم کے کتنے بچے اسی طرح برباد ہوتے ہیں۔

میں نے بہت ہی دھیمے لہجہ میں پوچھا کیا عمر رہی ہوگی آپ کے بچوں کی؟ سب سے بڑا بچہ کوئی آٹھ سال کا اس سے چھوٹی بچی تقریباً ۶ سال کی اور اس سے چھوٹا بچہ لگ بھگ چار سال کا تھا اور اب ماشاء اللہ سب اسی حساب سے بڑے ہوگئے ہیں انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کیا تنخواہ دیتے تھے آپ مولوی صاحب کو؟ میرے اس سوال پر جیسے وہ چونک پڑے اور بات کو ٹالتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جی جناب

۔۔۔میں کیا بتاؤں بس اس ذکر کو چھوڑ ہی دیجئے، ورنہ مولوی صاحب کیساتھ میں نے جتنا بہتر سلوک کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے نے کیا ہو، مگر اس شخص نے کبھی نمک کا خیال نہ کیا، اور بس دن بھر بچوں سے پنکھا جھلوایا کرتا تھا، میں نے کہا خیر آپ کے بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی بتا دوں، غالباً آپ پانچ روپیہ مہینہ دیتے رہے ہونگے، صاحب بہادر نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا، آپ تو مجھے نجومی لگتے ہیں، میں نے بڑی سادگی سے کہا، دیکھئے ابھی میں آپ کو کیا کیا لگتا ہوں، ویسے جو بات میں نے بتائی ہے اس کا تعلق علم نجوم سے کچھ بھی نہیں، وہ تو ملک گیر ریٹ کا حساب لگا کر میں نے بتایا تھا، دو قل اور ایک بافہ کے حساب سے پانچ روپئے ہی ہوتے ہیں، ہمارے ملک میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے عام طور پر یہی ریٹ مقرر ہے، ویسے کہیں کہیں ایک روپیہ میں بھی کام چل جاتا ہے بہر حال زیادہ سے زیادہ ریٹ دو روپیہ بچہ ہی ہے اور بھئی قرآن مجید کی تعلیم پر اس سے زیادہ خرچ بھی کیا کیا جا سکتا ہے جبکہ قرآن مجید پڑھ لینے سے کوئی سرکاری ملازمت بھی نہیں ملتی، یہ تو محض اپنے شوق کی بات ہے،

خدا آپ کا بھلا کرے، پھر آپ ہی بتائیے کہ جب میں ان مولوی صاحب کو پورا پورا حق المحنت بھی دیتا تھا تو ان کو یہ نمک حرامی کیونکر زیب دیتی تھی، صاحب بہادر نے مکمل فاتحانہ انداز میں ارشاد فرمایا،

میں نے بڑی فرمانبرداری کیساتھ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پوچھا کہ آخر تین سال میں مولوی صاحب نے کچھ بھی پڑھایا، یا نہیں؟ صاحب بہادر جھٹ سے بولے، پڑھایا کیا دونوں بڑے بچوں کا قرآن مجید ختم کرا دیا، اور ایک

آدھے حصے تعلیم الاسلام کے پڑھا دیئے اور چھوٹے بچے کو صرف چار پارے ہی پڑھا پائے، ہو گئی نہ حد آرام طلبی اور نمک حرامی کی؟

اپنی گفتگو کے آخری جملوں پر انھوں نے کچھ اس انداز میں زور دیا، جیسے میرے پاس بس اب سوائے خاموش ہونے کے کوئی چارہ نہیں رہ گیا، قبل اس کے کہ میں ان کی بات کا کچھ جواب دوں، انھوں نے نتیجہ خیز انداز میں اعلان فرمایا، اسی وجہ سے مجھے مولویوں سے نفرت ہو گئی ہے، اور میرا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی ناکارہ اور آرام طلب قوم ہوتی ہے۔

میں نے کہا آپ کا فرمانا درست ہے، مولوی صاحب کی سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ وہ مولوی ہوئے، اس کے بعد بھی انھوں نے غلطی پر غلطی یہ کی کہ قرآن مجید کی تعلیم دینے کا کام شروع کیا، اور پھر سب سے آخری اور سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ تین سال میں آپکے دو بچوں کو قرآن مجید ختم کرا دیا، اور اسی کے ساتھ ساتھ تعلیم الاسلام جیسی دینی مسائل کی کتاب کے کئی حصے بھی پڑھا دئیے، اور ننھا سا کمسن بچہ جو بچا اسے بھی بگاڑنے سے نہیں چوکے، اور کئی پارے (۴) کو بھی پڑھا دیئے۔ حالانکہ ان کو چاہیئے یہ تھا کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھتے، بچوں کو یونین بنانے کا طریقہ بتاتے، یونین کے فوائد سمجھاتے، یونین کے ذریعہ طاقت کے استعمال کا طریقہ بتاتے، بے ٹکٹ سفر کرنے کا ڈھنگ بتاتے، ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کے اصول بتاتے، ہڑتال جیسی عظیم عوامی نعمت کے فائدے بتاتے، بڑوں کی تحقیر اور چھوٹوں کی تذلیل جیسے ہمہ جہتی پروگرام پر لکچر دیتے، مگر انھوں نے یہ سب کچھ نہ کر کے قرآن مجید پڑھا دیا، جس میں ان نعمتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں ہے پھر یہی نہیں بلکہ

ظلم بالائے ظلم یہ کیا کہ اپنی خدمت کرا کرا کے استاد اور ماں باپ کی خدمت نیز بڑوں کی اطاعت کا عادی بنا دیا، جو آپ کے بچوں کے مستقبل کیلئے بڑی رکاوٹ ہے۔

واقعی آپ ہمدردی کے مستحق ہیں آپ کے بچے اتنا بگڑے اتنا بگڑے کہ مسلمان کہلانے کے قابل بن گئے! جو سب کچھ مولوی صاحب کی "نمک حرامی"۔، کی بدولت ہی ہوا، ورنہ آپکو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا، گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی، حیا گھاٹ اسٹیشن آچکا تھا، میں صاحب بہادر سے مصافحہ کر کے گاڑی سے اتر آیا۔

جہاں تک وہ مجھے نظر آئے میں پلٹ پلٹ کر ان کو دیکھتا رہا، وہ کھوئی کھوئی اور اداس نظروں سے مجھے گھورتے رہے وہ مجھے رخصت کرتے وقت بھی نہیں مسکرائے تھے اور پھر بعد میں بھی ان کے چہرہ پر مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔

معلوم نہیں کیا سوچ کر!!-؟

حلوے کی قسمیں

یوں تو نانی اماں سراپا خیر و برکت ہیں اور ان کی ذ ے گھر میں دینداری کا جس انداز میں چرچا ہے وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ کسی تیوہار یا کسی تقریب کے موقع پر ان کی شان ہی دوسری ہوتی ہے، بات اصل میں یوں ہے کہ تیوہار یا تقریب کو نانی اماں شروع ہی سے اپنا دن کہتی آئی ہیں اس لئے کہ ایسے موقع پر ان کی رائے کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی ہے اور محض اس وجہ سے کہ انھوں نے بڑے دن دیکھے ہیں، بزرگوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں، اور اللہ والوں سے روحانی فیض حاصل کئے ہیں، ان کی رائے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔

نانی اماں کو بزرگوں سے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے، اور انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ بزرگوں کو اپنے گھر بلاتے رہنا، اور ان کی دعوتیں اور خاطر مدارات کرتے رہنا چاہیئے، اس سے بڑی خیر و برکت ہوتی ہے خود اپنی ذات کے سلسلہ میں ان کا قطعی فیصلہ ہے کہ سات کم سو سال عمر ہونے کے باوجود ابھی تک حافظہ میں بزرگوں کی سیٹھی اور پیاری باتوں کا محفوظ رہنا اسی تعلق کا نتیجہ ہے۔

یہ بات میں اپنے بچپن سے دیکھتا چلا آرہا ہوں کہ شادی بیاہ ہو یا کوئی دوسری

تقریب، اسی طرح کونڈے ہوں، شبرات ہو یا سال کا کوئی بھی دوسرا تیوہار، جوں جوں کسی تیوہار یا کسی تقریب کا زمانہ قریب ہوتا جاتا ہے، نانی اماں کی گھر پر گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے، اور دو چار دن پہلے تو جیسے وہ "چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر" ہو جاتی ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی جملہ زبان سے نکال سکے، یا ان کو کسی بات میں روک ٹوک سکے،

اس سلسلہ کا وہ واقعہ مجھے بھلائے نہیں بھولے گا کہ ایک سال محرم کے موقع پر ماموں میاں کو "امام کا فقیر" بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، جب ماموں میاں کو نانی اماں نے سبز کرتا اور سبز ٹوپی پہننے کے لئے دیا، تو ماموں میاں ٹھنک کر بولے، نہیں اماں ہم یہ رنگین زنانے کپڑے نہیں پہنیں گے، یہ لڑکیوں کو پہننا چاہیئے، بس پھر کیا تھا، نانی اماں کا غصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، بگڑ کر بولیں، جا کلموہے تیری عاقبت خراب ہوئی ہے، تیرے نصیبوں میں ٹھوکریں لکھی ہیں، میں تو سمجھ ہی رہی تھی کہ اس موئے وہابی جماعتیئے کا ساتھ کچھ نہ کچھ رنگ ضرور لائیگا بار بار منع کیا، بھیا یہ جماعتی اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کا سنگ ساتھ اختیار کیا جائے، یہ نرے وہابڑے ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں نہ بزرگوں کا احترام ہوتا ہے نہ اللہ والوں سے محبت ہے، یہ تو بس ہر وقت نماز اور تسبیح کی بات کیا کرتے ہیں، جیسے سارا دین بس نماز روزے اور تسبیح ہی میں ہے، ان موئے بدنصیبوں کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ اللہ والوں سے محبت کے بغیر نہ نماز ہوتی ہے اور نہ روزہ مگر یہ ضدی لڑکا نہ ماننا تھا نہ مانا، آخر "سنگ صحبت تخم تاثیر" والی بات رنگ لائی، اور آج اس نے امام کے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا،

نانی اماں ایک سو بیس کلو میٹر کی رفتار سے اپنا غصہ نشر کر رہی تھیں گھر کے سبھی چھوٹے بڑے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ماموں میاں بے چارے ایک کونے میں کھڑے منہ بسور رہے تھے اور میں! میں بڑے رشک کے ساتھ نانی اماں کو دیکھ رہا ہے لعد دل ہی دل میں اس کہاوت کی سچائی پر دل وجان سے یقین کر رہا تھا کہ "کبھی گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں،، میں سوچ رہا تھا کہ وہی نانی اماں ہیں جو ٹوٹے بسولے پر پڑی کھانسا کرتی ہیں، گھر کے کسی معاملہ سے ان سے کوئی مطلب نہیں، بچہ سے لیکر بوڑھے تک کوئی بھی عام دنوں میں انکو لفٹ نہیں دیتا، مگر آج انکا جلوہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑوں کی مداخلت اور چھوٹوں کی خوشامد سے کافی دیر کے بعد نانی اماں کا غصہ ٹھنڈا ہوا، اور بالآخر ماموں میاں کو بقول ان کے وہی،، زنانہ کپڑے" پہنا کر محلہ بھر میں بھیک مانگنا پڑی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عبرت آموز سانحہ کے بعد پھر کس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ نانی اماں کے "ان خاص دنوں" میں انکے احکام کی خلاف ورزی کر سکے، اور میں تو بھائی یوں بھی نانی اماں کے احکام کی تعمیل میں اپنا فائدہ سمجھتا ہوں، کیونکہ نانی اماں کے ہر "دیو گرام،، میں کھانے پینے کی بات ضرور ہوتی ہے چاہے وہ پیر صاحب کی دعوت ہو یا محرم کا کھیچڑا، کونڈوں کی ٹکیاں ہوں یا شبرات کا حلوہ، بہر حال کسی نہ کسی بزرگ کے نام پر کھانے پینے کا اچھا خاصا پروگرام رہتا ہے پھر بھلا مخالفت کہاں کی عقلمندی ہو سکتی ہے اسی لئے ہر تقریب یا تیوہار سے ایک آدھ ہفتہ پہلے ہی سے میں نانی اماں کے پاس آنے جانے لگتا ہوں ان کو

تمباکو کی ڈبیا اٹھا کر دیتا ہوں، انکے لوٹے میں پانی بھر دیتا ہوں، اور دس پانچ منٹ بیٹھ کر ان سے سرباری بھی کر لیتا ہوں، یہ سب اس لئے کہ عین تیوہار کے دن نانی اماں کی مجھ پر "خاص نظر" رہے۔ کیونکہ اس دن ان کی نظر کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔

آپکو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ادھر تین ہفتہ کے فاصلہ سے سال کے دو اہم تیوہار تابڑتوڑ پڑ رہے ہیں، تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں، کون صحیح العقیدہ مسلمان ہوگا جو ۲۲ رجب کے کونڈے اور ۱۴ شعبان کی "شبرات" سے ناواقف ہوگا، تیوہار دونوں ہی نفع بخش بھی ہیں اور مقوی معدہ بھی، البتہ فرق اتنا ہے کہ بقول نانی اماں کے دہابیوں کی زہر افشانی اور زبردست پروپیگنڈہ کی وجہ سے سنی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ۲۲ رجب کو امام جعفر صادق کیطرف منسوب کرنا محض روافض کی شاطرانہ چال ہے کیونکہ نہ تو ۲۲ رجب امام جعفر صادق کا یوم ولادت ہے اور نہ ہی یوم وفات، اور نہ ہی اس تاریخ میں ان کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ رونما ہوں پھر کیا وجہ ہے کہ اسی خاص تاریخ کو ان کے نام کا فاتحہ کیا جائے، اور چوری چھپے ٹکیاں ہی پکا کر کھائی جائیں، جبکہ عام طور پر کسی بزرگ کا یوم یا تو ان کی ولادت کے دن منایا جاتا ہے یا پھر وفات کے دن، اس دن اصل میں حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی ہے جس کی خوشی رافضیوں کو منانا تھی، مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کا بیٹا یزید تخت نشین تھا، جس کی وجہ سے یہ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس دن کھلے عام خوشی منائی جاتی، اس لئے گھروں میں چھپ چھپ کر پکوان پکے اور بہت ہی خفیہ طریقے پر گھروں میں چھپ چھپ کر ہی کھایا گیا، اور پھر بعد میں

سنیوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کے لئے یہ اڑا دیا کہ "امام جعفر صادق" کا فاتحہ ہوتا ہے، وہابیوں کا یہ پروپگنڈہ صحیح ہو یا غلط مگر تاریخی اعتبار سے کچھا تنا سچا ہے کہ بہت سے صحیح العقیدہ اشخاص بھی اس چکر میں آگئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کونڈوں کا زور بہت کم ہوگیا ہے، کیونکہ حضرت معاویہ رضی کو جو صحابیٔ رسول تھے ہر سنی مسلمان مانتا ہے اور وہابیوں کے اس پروپیگنڈہ کے بعد جیتے جی مکھی نگلنے پر کوئی تیار نہیں ہوتا،

مگر خدا کا شکر ہے کہ ابھی شبرات پر وہابیوں کا داؤں نہیں چل سکا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس میں اضافے ہی ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے صرف حلوے اور خوشبو کا انتظام ہوتا تھا۔ مگر پچھلے لوگوں کو اس کی طرف توجہ نہ تھی کہ سوئی ہوئی روحوں کو بیدار کر کے گھروں میں لانا ہے، جس کے نتیجہ میں ایسا ضرور ہوتا رہا ہوگا کہ بہت سی روحیں سوئی رہ جاتی ہونگی، اور رات گذر جاتی ہوگی، خدا بھلا کرے آتش بازی کا کہ اب اس کی دھوم دھام سے تمام روحیں بیدار ہو جاتی ہیں، اور اپنے اپنے گھروں پر آتی ہیں، اسی طرح پچھلے لوگوں کی دقیانوسیت کی وجہ سے نہ عورتیں قبرستان جا پاتی تھیں، اور نہ نوجوان، بس بوڑھے سوڑھے لوگ جا کر فاتحہ خوانی کر آتے تھے، مگر اب روحوں کی ضیافت کے لئے قبرستان میں باقاعدہ دوکانیں سجتی ہیں، جس کی وجہ سے عورتیں بھی اب آزادی کے ساتھ مردوں اور زندوں دونوں سے ملنے قبرستان چلی جاتی ہیں، اور ان کے طفیل نوجوان بھی اس رات قبرستان کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں، اس طرح سب کو ثواب کمانے کا موقع مل جاتا ہے،

بہر حال یہ تو نانی اماں کے ان ملفوظات کا خلاصہ ہے جو وقتاً فوقتاً ان کی زبان حقیقت بیان سے صادر ہو کر میرے دل میں محفوظ تھے۔ مگر ان سب سے اہم وہ انکشاف ہے جو نانی اماں نے اس مرتبہ میرے سامنے کیا۔ اور جس کو سن کر میں نانی اماں کی روحانیت کا پوری طرح گرویدہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ اتنا تو سبھی کو معلوم ہے کہ شبرات کے موقع پر مختلف قسم کے حلوہ جات بنتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال بھر کے بعد شبرات ہی کے موقع پر کھانے کو ملتے ہیں، مثلاً میدے کا حلوہ، آٹے کا نرم حلوہ وغیرہ۔ میں نے نانی اماں سے یوں ہی بات چلانے کے لئے دریافت کیا کہ نانی اماں یہ شبرات کے موقع پر قسم قسم کے حلوے کیوں بنتے ہیں، اور پھر سال بھر اتنی قسم کے حلوے کیوں نہیں بنتے۔ انھوں نے میری بات سن کر بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی، اور پھر مسکرا کر فرمایا۔

بیٹا! یہ سب باتیں بزرگوں کی صحبت سے معلوم ہو سکتی ہیں، آج کل کے نوجوان تو بزرگوں سے جیسے وحشت کھاتے ہیں، پھر یہ باتیں کیسے معلوم ہوں، خدا کا شکر ہے کہ تمہارے اندر دینداری ہے، اسی لئے تم ان باتوں کو معلوم کرنا تم ضروری سمجھتے ہو، تو سنو! میرے دل میں بھی یہ سوال بہت دنوں سے کھٹک رہا تھا ابھی پچھلے دنوں جب حضور پر نور صوفی بدر الدجیٰ صاحب اور عارف باللہ مرزا قلاقند صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے، تو میں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تھا، پہلے تو ان دونوں بزرگوں نے مجھے بڑی مشکوک نظروں سے دیکھا

تھا۔ بلکہ صوفی صاحب نے تو نہایت ہی حقارت کے ساتھ اعلان فرما دیا تھا کہ یہ کسی وہابی کی اپج ہے ورنہ کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو اس قسم کی بات سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی، مگر مرزا صاحب نے میری عمر بھر کی وفاداریوں کا حوالہ دیتے ہوئے صوفی صاحب کو اطمینان دلایا کہ آپ کی اس کنیز پر کسی وہابی مردود کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا، اس نے جو کچھ دریافت کیا ہے، وہ از راہ خلوص ہے، تب جاکر صوفی صاحب نے اطمینان کی سانس لی، اور پھر زیر لب تبسم کے ساتھ یوں فرمایا،

دیکھو جس طرح حلوے کی ظاہری طور پر قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً چنے کا حلوہ، سوجی کا حلوہ، میدے کا حلوہ، آٹے کا حلوہ، گاجر کا حلوہ، لوکی کا حلوہ وغیرہ۔ اسی طرح اس کی روحانی طور پر بھی قسمیں ہیں، مثلاً خدائی حلوہ، فرشتوں کا حلوہ، انسانوں کا حلوہ، جناتوں کا حلوہ، ہر ایک کے نام فاتحہ کرتے وقت اس کی رعایت ہونی چاہیئے کہ جس کے نام کا جو حلوہ ہو، اسے وہ استعمال کر سکے، مثال کے طور پر خدا قدیم ہے، اس کی عمر کی لمبائی کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے، اب اگر اس کے نام پر تم سوجی کا سخت حلوہ بھیجو تو کتنی زیادتی کی بات ہوگی، اس لئے خدائی فاتحہ کیلئے میدے کا نرم حلوہ تیار کیا جاتا ہے، بس اسی طرح دوسرے حلوہ جات کا معاملہ ہے،

نانی اماں اتنا کہہ کر بہت ہی فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگیں، اور میں سوچنے لگا کہ واقعی اللہ والوں کی صحبت سے دین و ایمان کو کتنی تقویت،، ملتی ہے۔

اے ناظرین باتمکین! مجھے یقین ہے کہ یہ انکشاف آپ کے لئے بھی،، ایمانی ترقیات،، کا سبب بنا ہوگا، اور آپ کے دل سے بے اختیار دعائیں نکل رہی ہونگی مگر خدارا صوفی بدر الدجیٰ، مرزا قلا قند اور نانی اماں کو دعائیں دیتے وقت اپنے میاں مردم شناس کو نہ بھولیئے گا، جس نے اپنے علم سینہ کو محض ہمدردی کے ناطے آپکے سامنے کھول

میرا گھوڑا آگے رہے

میاں مردم شناس

مستقبل قریب میں خطیب مشرق کاٹھیاواڑ اور گجرات کی مشترکہ کل جماعت سنی تبلیغی کانفرنس کرنے والے ہیں جو گودھرا سے عظیم اور بامقصد ہوگی۔

ایک خبر

خبر پڑھئے، اور ذرا غور سے پڑھئے، اور اسکے بعد بتلائیے کہ اس خبر سے آپ نے کیا سمجھا ہے نا کہ میرا گھوڑا بہر حال آگے رہے گا، کسی ٹاون ایریا، کسی میونسپل کارپوریشن، کسی ریاستی اسمبلی یا پارلیمنٹ کے الکشن میں کھڑے ہونے والے امیدواروں سے تو آپ ضرور ہی ملے ہونگے پھر الکشن لڑنے والے کسی بھی کمزور سے کمزور امیدوار کا ووٹنگ سے پہلے اور ووٹنگ کے بعد نتیجے کے اعلان سے پہلے تک کیا یہی دعوی نہیں ہوتا کہ میری جیت یقینی ہے اور ایسا بھی نہیں کہ یہ دعوی محض دعوی کی حد تک ہوتا ہو، آپ اس امیدوار سے بس اتنا کہہ کر دیکھئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر وہ آپ کے سامنے دلائل کے انبار لگا دے گا، اپنے پورے حلقہ کا جغرافیہ پیش کرے گا، آبادی کا جائزہ پیش کرے گا، ووٹروں کے رجحانات

کا تجزیہ کریگا، اور پھر نتیجہ خیز طریقہ پر آپ سے کہے گا، اور اس حساب سے تو کم از کم میری جیت ہوگی، آپ اس امیدوار کی بات پر یقین کریں یا نہ کریں، مگر اس کی بات کا جواب دینے سے عاجز ضرور ہو جائیں گے، آپ اس کا منھ دیکھتے رہ جائیں گے، اور وہ ایسی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ آپ کی بے بسی پر طنز کرے گا جیسے نتیجے کا اعلان ہو ہی گیا۔

آپ کا پالا اس قسم کے کسی امیدوار سے پڑا ہو، یا نہ پڑا ہو، میں تو اس کا شکار ہو ہی چکا ہوں، ابھی یوپی اسمبلی کے پچھلے الکشن کے موقع پر اپنے ایک بزرگ دوست بھی بس بات ہی بات میں اسمبلی جانے کا خواب دیکھ بیٹھے، لاکھ سمجھایا بجھایا، مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ وہ تو روز بروز اپنے ارادہ میں پختہ ہی ہوتے چلے گئے، اگر ایک طرف میرے جیسے کچھ سرپھرے ان کے اس خواب کو منتشر کرنے کی کوشش کرتے تو دوسری طرف سبز باغ دکھانے والوں کی بھی کمی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ نام داخل کرنے کی تاریخ آگئی، اور چند مسخرے لڑکوں کے ساتھ جاکر انھوں نے بھی اپنا نام داخل کر دیا، اور الکشن کی تیاریوں میں ہمہ تن ہو گئے دن کا چین اور رات کی نیندیں اپنے اوپر حرام کر لیں۔

تقریروں کے درمیان تالیاں بجانے والے نوجوانوں کو اپنا پر جوش حامی قرار دیکر وہ کہتے، "نوجوانو! جذبات کی ضرورت نہیں، انقلاب آکر رہے گا، تمہاری آرزوئیں پوری ہو کر رہیں گی، تمہارے مسائل حل ہونگے تمہیں ملازمت ملے گی، اور تمہاری پریشانیاں دور ہوں گی، بس میرے اسمبلی جانے کی دیر ہے، اور اس کام میں صرف ۱۵ دن رہ گئے ہیں، بس پندرہ

دن اور صبر کر لو۔"

راہ چلتے راہ گیر ان پر پھبتی کستے، "دیکھو یہی صاحب ہیں ان کی شکل دیکھو یہ اسمبلی کے ممبر بنیں گے، نہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، یہ کیا کریں گے اسمبلی میں جاکر اور ان کے جانے کا سوال بھی کیا ہے، کوئی ووٹر بے وقوف تھوڑی ہے جو اپنا ووٹ ان کے نام پر ضائع کر دے، مگر ان کا خیال ہے کہ یہ اسمبلی کے ممبر ضرور بنیں گے"

میرے دوست نے صاحب اس گفتگو کے تمام جملوں کو نظر انداز کر کے صرف آخری جملے پر توجہ فرماتے اور بڑے فخر کے ساتھ سینہ تان کر کہتے "آپ کے منھ میں گھی شکر، آپ کا یہ کہنا پورا ہو کر رہے گا، کہ یہ اسمبلی کے ممبر ضرور بنیں گے، بشرطیکہ آپ لوگوں کا جوش وخروش اسی طرح رہا، اور آپ لوگ کسی کے بہکائے میں نہ آگئے۔

اسی ہماہمی کے دوران کسی وقت اگر ہم لوگوں کو تنہائی میں موقع ملتا تو ان کے متعلق ووٹروں کے عام تاثر سے انھیں باخبر کر کے جب انھیں طلسمی دنیا سے باہر لانے کی کوشش کرتے تو وہ بگڑ جاتے، اور بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے حلقہ انتخاب کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے، دیکھو کانگریس سے عام بیزاری ہے، اس لئے اسے تو ووٹ ملنا نہیں ہے اور کوئی پارٹی اس قابل نہیں کہ اس کے امیدواروں کو ووٹ مل سکے، اور وہ کامیاب ہو سکیں، رہ گیا آزاد امیدواروں کا معاملہ تو ان سب میں میری پوزیشن سب سے زیادہ مضبوط ہے، مسلم ووٹ صد فی صد مجھے ملیگا، اسی فیصد ہریجن بھی میرے

ساتھ ہیں، اونچی ذات کے ہندوؤں سے میرے جتنے گہرے مراسم ہیں تم جانتے ہی ہو، اس لئے کم از کم پچیس فی صد ووٹ انکے بھی مجھے ملیں گے اور پھر تمام ووٹروں کی تعداد بتا کر وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ اس طرح تقریباً بیس ہزار ووٹوں سے تو میری جیت یقینی ہے۔ ویسے یہ ایک محتاط اندازہ ہے ورنہ جیت اس سے زیادہ ووٹوں سے ہوگی۔

وقت گذرتا چلا گیا، بنے صاحب کے منصوبے بھی آسمان کے تارے چھوتے چلے گئے، آخر پولنگ بھی ہوگئی، اور پھر جب نتیجہ کا اعلان ہوا، تو ہم لوگ اور بنے صاحب ع تو اس وجہ سے کہ ان کی ضمانت کیسے ضبط ہوئی، اور وہ کیونکر ہارے، اور ہم لوگ اس وجہ سے کہ بنے صاحب کو ۶ سو ووٹ کسطرح مل گئے، اور کیا صرف ایک اسمبلی حلقہ میں ۶ سو بے وقوف موجود ہیں، پھر پورے ملک کی آبادی میں بے وقوفوں کا کیا تناسب ہوگا؟ یہ تو اسمبلی کے ایک الکشن کا معاملہ تھا، آپ اسے یہ کہہ کر بھی ٹال سکتے ہیں، ع

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں

مگر اب تو دین و مذہب کے معاملے میں بھی ریس شروع ہوگئی ہے اور اس ریس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بظاہر کسی کی ہار نہیں ہوتی، ہر گھوڑا آگے ہی رہتا ہے، پیچھے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں قلم آزاد ہے۔ اب اس آزادی میں خودسری کا بھی اضافہ کر لیا گیا ہے کسی بھی دینی اجتماع یا کانفرنس کے مقابلہ میں دوسرے اجتماع یا کانفرنس کا ہونا فیشن میں داخل ہو گیا ہے اور پھر ان کانفرنسوں کی رپورٹنگ کے

ع دونوں جہان سے گئے ہم خانہ خراب

وقت قلم کی آزادی دکھانے کا پورا پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے، خصوصیت کیساتھ جراتی کانفرنس یا اجتماع کے شرکار کی تعداد لاکھوں سے کم بتائی ہی نہیں جا سکتی۔

شیخ سعدیؒ کا قصہ مشہور ہے کہ ان کی ملاقات ایک "حضرت" سے ہوئی اور انھوں نے اپنی توپی کٹھ حجتی "سے کام لیتے ہوئے شیخ سعدیؒ کو ترکی بہ ترکی جواب دینا ضروری سمجھا، شیخ سعدیؒ نے جب اپنا تعارف کرایا "من شاعرم" تو انھوں نے بھی برجستہ جواب جڑا، "من مارُرم" شیخ سعدی نے شعر کی تعریف کی "شعر او را گویند کہ قافیہ وزن دارد" حضرت بولے "میر او را گویند کہ کہ مافیہ مزن دارد" شیخ سعدی نے ان ذات شریفہ کو پہچانتے ہوئے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے کہا "جواب جاہلاں باشد خموشی" بھلا وہ مناظر بے بدل نچا بیٹھ کر اپنی سبکی کیسے کراتا، فوراً ہی جواب دیا "مواب ماہلاں ماشد ممو شی"

شیخ اور حضرت دونوں کی گفتگو آپ کے سامنے ہے شیخ کے جملوں کا مطلب معمولی فارسی داں بھی سمجھ سکتا ہے، مگر حضرت کے جوابات کو سمجھنے کے لئے ملک "جہالت گڈھ" کی مخصوص قوم "گپیوں" کی زبان کا علم حاصل ہونا ضروری ہے۔

خیر "حضرت" کے جوابات سمجھنا آپکے لئے کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے ہاں یہ ضرور سمجھیے کہ ایسا حادثہ ہوا کیوں؟ تو وجہ سامنے ہے کہ ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے، ہمارا گھوڑا آگے رہنا چاہیئے، یہ حادثہ آج سے صدیوں پیشتر شیخ سعدی

کو پیش آیا تھا۔ ایسا نہیں کہ یہ تاریخ کا پہلا اور آخری حادثہ ہو، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے حادثات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے کہ نہ شیخ سعدی کے وارثین کی کمی ہے اور نہ حضرت کے جانثاروں کی۔

بات آگے بڑھ گئی! مجھے تو آپ سے صرف اوپر والی خبر کے سلسلہ میں کچھ کہنا تھا، بات یوں ہے کہ تبلیغی جماعت کی طرف سے گودھرا میں بہت بڑے پیمانے پر ایک عالمی اجتماع کا انعقاد ہوا۔ اس اجتماع میں بہت ہی محتاط اندازہ کے مطابق کم از کم دس لاکھ بندگان خدا نے شرکت کی، ملک کے پورے پریس نے اپنے وبیگانے کی تقسیم و تفریق کے بغیر اس اجتماع کو بہت ہی عظیم قرار دیا ہے۔ اب "خطیب مشرق" کی طرف سے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ گودھرا سے عظیم اور بامقصد کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا ہے۔

جہاں تک عظیم کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں کانفرنس ہونے سے پہلے کوئی بات کہنا قبل از وقت ہوگا، کیونکہ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کریگا پھر بفضلہ تعالیٰ ہمارے ملک ہندوستان سے دیانت دار صحافت بالکل ہی ختم نہیں ہو گئی ہے، اس لئے "عظمت" کا فیصلہ مستقبل کا پریس آسانی سے کر دیگا، مگر ہاں "بامقصد" کی خوب رہی، بامقصد کا مطلب یہ ہوا کہ گودھرا والی کانفرنس بے مقصد تھی، میں کافی غور و خوض کے بعد بھی اس موقع پر "بامقصد" کا مفہوم نہ سمجھ سکا، کسی سیاسی کانفرنس کے سلسلہ میں اگر اس قسم کی بات کہی گئی ہوتی، تو اس کا سمجھنا بالکل آسان تھا اور اگر سمجھ میں نہ آتا تو یہ کہہ کر فرصت حاصل کر لی جاتی کہ بھئی "یہ سیاسی رموز" ہیں جنھیں سیاسی حضرات

ہی سمجھ سکتے ہیں. مگر گودھرا کے عظیم اجتماع کے مقابلہ میں عظیم کانفرنس کیلئے "بامقصد" کے استعمال سے تو تشویش پیدا ہو گئی ہے کیونکہ گودھرا کے اجتماع یا اس جیسے دوسرے تبلیغی اجتماعات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں کا ٹوٹا ہوا تعلق اللہ سے جوڑ دیا جائے. جو بے نمازی ہوں ان کو نمازی بنانے کی کوشش کی جائے، اور جو دین سے غافل ہیں ان کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے،

دنیا نے دیکھا کہ گودھرا کے اجتماع کے دوران لاکھوں بندگان خدا نے ایک امام کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا روح پرور منظر پیش کیا، ذکر و فکر کی محفلیں گرم ہوئیں، بہتیرے خدا کے غافل بندے مختصر عرصے ہی کے لئے سہی خدا کیطرف متوجہ ہوئے،

اگر ایسے اجتماع کو "بے مقصد" قرار دیکر اس کے مقابلے میں کسی "بامقصد" کانفرنس کا پروگرام اسلام ہی کے نام پر بنایا جائے تو آپ ہی بتائیے کہ تشویش ہوگی یا نہیں۔

اے ناظرین باتمکین! اس "بامقصد" اور "بے مقصد" کی ترکیب نے آپ کے "میاں مردم شناس" کو سخت تشویش میں مبتلا کیا ہے، اگر آپ کی نظر میں اس کا کوئی حل ہو تو ضرور بتائیے، تاکہ بیٹھے بٹھائے کی اس مصیبت سے نجات مل سکے. کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ "میرا گھوڑا آگے رہے" والی بات ہو۔

نئے دور کے نئے مسائل

صوفی دل قرار نے تیسری شیرمال کا آخری چوتھائی ٹکڑا اپنے حلق میں ڈھکیلتے ہوئے انتہائی عجلت کے انداز میں فرمایا جلدی کرو، ابھی ناکہ والے مرزا الجھن کے یہاں بھی چلنا ہے اور پھر صوفی آرپار کے یہاں کھانے کی دعوت پر بھی پہنچنا ہے سعادت مند صاحبزادہ نے جلدی جلدی اپنی پلیٹ صاف کرنا شروع کی، اور صوفی صاحب چائے کی کیتلی پر ٹوٹ پڑے، دو کپ چائے حلق میں انڈیلنے کے بعد ایک بھیانک قسم کی ڈکار لیتے ہوئے انھوں نے صاحب خانہ اور اپنے میزبان رشید صاحب سے فرمائش کی، آپ کے پاس پچنول تو نہ ہوگی، رشید صاحب لپک کر گھر کے اندر گئے اور پچنول کی شیشی لاکر ان کی خدمت میں پیش کردی، صوفی صاحب نے ۴ ٹکیاں ہتھیلی پہ رکھ کر حلق میں شاٹ ماری، اور ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے انھیں اتارتے ہوئے ۴ مزید ٹکیوں کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں ڈالا، اور پھر صاحب خانہ سے اجازت لے کر آئندہ آنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

اس پوری کارروائی کو میں دیدے پھاڑے پھاڑے انتہائی حیرت کے

ساتھ دیکھتا رہا، مگر ظاہر ہے کہ بیچ میں دخل دینے کا کیا سوال تھا۔ البتہ صوفی صاحب کے رخصت ہونے کے بعد میں نے رشید صاحب سے سوال کیا کہ یہ بزرگ آپکے یہاں کب سے آنے جانے لگے ہیں؟ رشید صاحب نے نہایت ہی لاپروائی کے ساتھ اوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا، یہی کوئی چھ ماہ سے اور قبلہ و کعبہ کا ستر ھواں پھیرا تھا، کیوں تم ان کو کیسے جانتے ہو، ؟ جی میں، یہ میرے ننھیالی پیر ہیں، اس لئے میں ان کو اوپر سے نیچے تک اور اندر سے باہر تک جتنی اچھی طرح جانتا ہوں، آپ لوگ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جانتے ہوں گے، مگر حیرت ہے کہ آپ سے انکے اتنے گہرے مراسم کیسے ہو گئے، ؟ رشید صاحب نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا، دراصل بات یوں ہے کہ صوفی دل قرار میری بیوی کے جہیز میں بطور پیر مجھے ملے ہیں،

جی! آپ نے کیا فرمایا؟ کیا پیر بھی اب جہیز میں دئے جانے لگے ہیں، آج آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں؟

رشید صاحب بولے، آپکو معلوم نہیں، یہ بیسویں صدی ہے یہ سائنسی دور ہے اب اس دور میں اگر آپ ہر چیز کو پرانے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کریں گے۔ تو ناکام رہیں گے۔ تو کیا دین کے معاملات میں بھی اب نئے پیمانے اور نئے اصول وضع کئے جائیں گے؟ میں نے حیرتوں کے دریا میں ڈبکی لگاتے ہوئے سوال کیا، رشید صاحب نے بڑے پیار سے میرے کاندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا، ڈیر! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ذرا سوچو تو سہی دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی، انسان چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے، اس وقت کا انتظار کرو، جب

حضرت گنج اور امین آباد کی بڑی بڑی دوکانوں پر پلاسٹک کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں شوکیش میں سجے نظر آئیں گے۔ نوٹ دو، اور خانۂ ولدیت میں اپنا نام رجسٹرڈ کرا کے ان کو اپنے ساتھ لے آؤ، پھر وہ تمہارے بیٹے بیٹی کی روپ میں باقاعدہ تمہارے درمیان زندگی بسر کریں گے، وہ تمہیں اٹھلا کرابّا اور تم انھیں پھسلا کر بیٹا کہو گے،

کیسی مسخری باتیں کر رہے ہو، میں نے رشید صاحب کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

رشید صاحب بولے، ارے کیسی مسخری باتیں تم کس دنیا میں رہتے ہو کچھ لسندت کی خبر بھی ہے، میاں نلکی زادی کی ولادت ہو چکی ہے، اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کو ملا ہے کہ اس نلکی زادی سے شادی کرنے کے لئے لوگ اس کی جوانی تک یا یوں کہیے کہ اپنے بڑھاپے تک انتظار کرنے کو تیار ہیں، کیا اب بھی تم کو کچھ شبہ ہے کیا دس بیس برس بعد میں سائنس سے یہ امید نہیں کر سکتا کہ پلاسٹک کے کھلونے بنانے والی مشین کے ذریعہ بھی بچہ پیدا کرالے، اور پھر پلاسٹک کے بیٹے بیٹیاں مارکیٹ میں فروخت ہونے لگیں۔؟

اچھا خیر چھوڑو اس ذکر کو یہ تمہارے بھیجے میں اترنے والی بات نہیں ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ادھ پی بھیجوں سے کام نہیں چلیگا۔ کم از کم ایک کلو کا بھیجا ہونا چاہیئے۔ اور تمہارے پاس ابھی اس کا پاؤ بھی نہیں ہے۔

سنو صوفی دلقرار بطور پیر مجھے جہیز میں اس طرح ملے، کہ میری زوجہ خوش اطوار کے والد بزرگوار کی پہلی بیوی کے نانا صوفی دلقرار کے سوتیلے دادا کے

خلیفہ اول تھے، انھوں نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد میرے خاندان کی شاخ در شاخ نسلیں پیر صاحب کے وارثین کی ہی مرید ہوں، ظاہر ہے کہ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس لئے ان کی بیٹی ہی پر اس وصیت کی تکمیل کی پابندی عائد ہوتی تھی، صوفی دل قرار کے والد ماجد اپنی زندگی تک بلا شرکت غیرے پیر رہے، اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں پیدا ہوا۔ مگر ان کی آنکھ بند ہوتے ہی صوفی دل قرار کے چچازاد بھائیوں نے سگے سوتیلے کا جھگڑا اٹھا کر کے خاندانی پیری پر اپنا قبضہ جمانے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں، نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی، بالآخر حق بحقدار رسید کے مصداق صوفی دل قرار نے مقدمہ جیت لیا، اور وہ رجسٹرڈ پیر ہو گئے، اور انھوں نے عام منادی کرا دی کہ دادا جان کے تمام مریدوں اور مریدنیوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے شاخ در شاخ خاندان کے ساتھ میرے ہاتھوں پر تجدید بیعت کر کے دادا صاحب سے اپنے تعلق کا ثبوت دیکر سرٹیفکٹ حاصل کریں، چنانچہ میری اہلیہ کے والد نامدار نے بھی تجدید بیعت کی، اور صوفی دل قرار کو میری سسرال میں انٹری مل گئی۔

اہلیہ کا بیان ہے جس پر میرا ایمان ہے کہ صوفی صاحب کی کئی مرتبہ فرمائش کے باوجود ابھی ان کا آمنے سامنے کی گفتگو کا سلسلہ نہیں قائم ہو سکا ہے اور ان کو اپنے مائیکہ میں صوفی دل قرار کے روبرو حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوتی ہے تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میری یہ شادی کس طرح ہوئی ہے۔ "مرضی کے خلاف" ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے سسر صاحب نے جہیز کے نام برادر کوئی چیز تو دی نہیں، مگر ہاں ساری کمی پوری کرنے کے لئے ۲ کلو کم ایک کونٹل وزن کے صوفی

دل قرار کو ضرور میرے حوالہ کر دیا ہے۔ یہ ہے صوفی دل قرار کے جہیز میں ملنے کی داستان، اسی سلسلہ میں صوفی دل قرار کا یہ سترھواں پھیرا تھا، اہلیہ کا خیال ہے کہ اب پردے کے روایتی بند ھن کو توڑنا ہی پڑیگا، اور میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے بکہ محدود آمدنی کے ساتھ صوفی صاحب کے مستقل پھیروں کا خرچ کو کس طرح برداشت کیا جائیگا کیونکہ ادھر متواتر عید کے دن ملاقات کے لئے آمد کے سلسلہ میں صوفی صاحب کا یہ چوتھا دن تھا۔

میں رشید صاحب کی اور تمام باتیں تو بڑی دل چسپی کے ساتھ سنتا رہا مگر ان کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا، میں نے پوچھا کیا مطلب؟ عید کے دن آمد کے سلسلہ میں چوتھا دن، عید تو ایک ہی دن ہوتی ہے پھر وہ عید سے قبل یا عید کے بعد آنا ہوا۔

رشید صاحب نے نہایت ہی کڑوی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا، یہی تو سمجھنے والی بات ہے کہ عید اب تک ایک دن ہوا کرتی تھی مگر صوفی صاحب کا خیال ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اب اس پر نظر ثانی کرنا پڑی ہی چنانچہ ان کی تھیوری سے اگلی عید چار دن ہوئی، بعض لوگوں نے رمضان کا چاند بھی ۲۹ر کا تسلیم کیا اور عید کا بھی، ان کے حساب سے ظاہر ہے کہ عید ۲۹ر کی ہوئی، مگر جن لوگوں نے رمضان کا چاند ۳۰ر کا تسلیم کیا ان لوگوں کے حساب سے یہی عید ۲۸ر کی ہوگئی پھر بعض لوگوں نے دونوں چاند ۳۰ر کے مانے تو جن لوگوں نے رمضان والے کو ۲۹ر کا مانا تھا ان کے لحاظ سے یہی عید ۳۱ر کی ہوگئی۔

اس حساب سے اگلی عید ۲۸، ۲۹ر، ۳۰ اور ۳۱ر چاروں حساب سے ہوئی، صوفی

صاحب کا خیال ہے کہ صرف انگریزوں کو ہی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ چاروں طرح کے مہینے بنائیں، مسلمانوں کو بھی اس کا بھرپور حق حاصل ہے، چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر صرف دو مہینوں میں ہیر پھیر کرکے اسلامی مہینوں کو ماڈرن بنالیا گیا ہے، اور اب ہم بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ بعض علاقوں کی عید دوسرے بعض علاقوں کے حساب سے ۲۸ رکی ہوئی اسی طرح دوسرے بعض علاقوں کی عید اس علاقہ کے لحاظ سے ۲۹ رکی اور دوسرے علاقوں کے لحاظ سے ۳۰ رکی ہوئی، اور اسی طرح بعض علاقوں کی عید ان کے لحاظ سے ۳۰ اور دوسرے بعض علاقوں کے لحاظ سے ۳۱ رکی ہوئی، رشید صاحب نے اتنا کہہ کر فکر انگیز خاموشی اختیار کرلی۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی یہ کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ مطلع ایک، چاند ایک اور رمضان اور عید کا دارومدار بھی اسی ایک چاند پر، ہر شہر میں چاند کی صحیح خبر فراہم کرنے کیلئے رویت ہلال کمیٹی بھی قائم پھر کیا چاند کئی ہوگئے؟ اور کیا اب کئی چاند نکلا کریں گے؟ اور ہجری سال میں بھی ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱ تمام دنوں کے مہینے ہوا کریں گے۔۔؟

بقر عید آگئی ہے

عید تو خیر جیسی تیسی گزر جاتی ہے لیکن بقر عید ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، پہلا اعتراض تو مجھے اس کے نام ہی پر ہے بقر عید کا مطلب میں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں گائے والی عید سمجھا ہے یہ اصطلاح میرے خیال میں اس وقت تک تو درست تھی جب تک بزرگوں کے بیانات اور کتابوں میں لکھے واقعات کی روشنی میں ہندوستان میں گائے کی قربانی بھی ہوا کرتی تھی، مگر اب جبکہ آزاد ہندوستان میں گائے کی قربانی گائے کے مذہبی احترام کے پیش نظر بند کر دی گئی ہے، تو اس کا نام بقر عید رکھنا کچھ عجیب سا لگتا ہے، اب میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کا نام بدل جانا چاہیئے اس سلسلہ میں چند نام پیش کرتا ہوں، قارئین کو کوئی نام پسند ہو تو اسے رکھنے اور ترویج دینے کی کوشش کریں۔

(۱) خاموش عید، چونکہ بھینس بھینسے کی قربانی پر کوئی پابندی نہیں ہے اور کثرت کے ساتھ کم خرچ بالانشین کے فارمولے کے مطابق اس کی قربانی

ہوتی ہے۔ اس لئے پہلا ترجیحی نام میری نظر میں یہی ہے،

(۲) شاۃ عید، عربی زبان میں شاۃ بکری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بکرے کے لئے بھی غالباً کوئی علاحدہ لفظ استعمال نہیں ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اہل ذوق کو بکرے کی قربانی کو بکری والی عید کی طرف منسوب کرنا گراں گزرے، مگر اگر اتنی سی بات کو نظر انداز کیا جاسکے تو یہ نام بھی اچھا رہے گا۔

ہاں یہ وضاحت کر دوں کہ میں نے غالباً اس لئے کہا کہ عربی زبان میں مجھے فی الحال کوئی مہارت نہیں ہے، ان دنوں میں دنیا کی دوسری اور اپنے خزانۂ معلومات کی تیرھویں زبان عربی پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ قارئین اطمینان رکھیں، عنقریب ہی میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ غالباً کا لفظ ہٹا سکوں۔

بہرحال بات یہ چل رہی تھی کہ دوسرا ترجیحی نام میری نظر میں شاۃ عید ہے،

(۳)، اس سلسلہ کا تیسرا اور آخری نام میری سمجھ سے "اہل عید" بھی ہو سکتا ہے، مگر اس میں ذرا سی دشواری یہ ہے کہ ہمارے دیش میں اونٹ کی قربانی بہت کم ہوتی ہے۔ پھر مثل مشہور ہے "اونٹ رے اونٹ تیری کون کل سیدھی"، اس لئے اونٹ کی قربانی ہے بھی بہت مشکل، ہندوستانی مسلمان عام طور پر ذرا سہولت پسند زیادہ واقع ہوئے ہیں۔ لہذا سات حصوں کے لئے اکثر بھینس یا بھینسا ہی پسند کر لیتے ہیں۔ ہاں کچھ شوقین مزاج لوگ کہیں کہیں اونٹ کی قربانی بھی کر لیتے ہیں، جو کافی اقلیت میں ہیں۔ اور اقلیت کی چیز کو اکثریت پر مسلط کرنا جمہوریت کے منافی پڑتا ہے، اور خیر سے ہمارا ملک جمہوری واقع ہوا ہے، اس لئے "اہل عید" نام کچھ جچتا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر قارئین پسند

کریں تو چل سکتا ہے ۔

خیر یہ تو تھی بقر عید کے نام پر اعتراض کی بات، چونکہ عرصے سے میرے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی، اور میں عجب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا اس لئے یہ سوچ کر اپنی بات سامنے رکھ دی، کہ اگر "ماڈرن ذوق" کے مطابق میری بات چل گئی، اور نام بدل گیا تو آنے والی نسلوں میں میرا بھی نام ہو جائیگا، یار لوگوں نے تو اس شوق میں معلوم نہیں دین میں کتنی ترمیمیں کر ڈالیں، یہ الگ بات ہے کہ ان ترمیموں کا نام "مخلصانہ اصلاح" رکھا، بہر حال آمدم برسر مطلب! میں یہ کہہ رہا تھا کہ بقر عید میرے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر آتی ہے، وجہ یہ ہے کہ قربانی کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے، قربانی کرنا ضروری اس لئے ہو گیا ہے کہ اب "کفایت شعاری اسکیم" کی وجہ سے وہ لوگ جن کے یہاں چھ چھ سات سات بکروں کی قربانی ہوا کرتی تھی اور کم از کم ایک ایک کلو گوشت بٹا کرتا تھا، اور کئی جگہ کے حصے ملا کر درمیانی درجے کے بکرے کے نصف بھر گوشت میرے گھر بھی پہونچ جایا کرتا تھا، اب یا تو ایک ہی دو بکروں پر کام چلا لیتے ہیں۔ یا پھر چھ سات بکروں کے بجائے وہی محبوب چیز "بھینس بھینسے" کی قربانی کر لیتے ہیں، دونوں باتوں کا "سائنٹیفک" اثر میرے گھر پر بھی پڑتا ہے، بکرے کا گوشت حصہ میں آیا تو ۲ بوٹی ایک ہڈی، اور بھینس کا آیا تو وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گھر والوں کا یہ کہنا بھی حق بجانب ہے کہ یہی تو ایک تیوہار ایسا ہے جسمیں "وہابیوں" نے کوئی فتویٰ نہیں ٹھونا، ورنہ حلوہ، گونڈہ، کھچڑا سب پر تو وہابیوں نے فتویٰ لگا رکھا ہے، گوشت آزاد ہے تو کم سے کم اس

کی آزادی کا تو بھرپور فائدہ ملنا ہی چاہیئے، بقر عید کے دنوں میں بھی دس پانچ کلو بکرے کا گوشت کھانے کو نہ ملے تو بیکار ہی ہے۔ تحفہ تحائف میں گوشت حاصل کرنیکے لئے گزرے دنوں کا ماتم کیجئے، اور مزے لے لے کر پرانے لوگوں کی سخاوت کے قصے نئے لوگوں کو سنائیے۔ بس ملنے ملانے کی آرزو پوری نہ ہوگی۔ اب لامحالہ ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ خود قربانی کیجئے، اور گوشت کھائیے، اور یہی مرحلہ قیامت کی یاد دلانے کے لیئے کافی ہے، بچوں کی ضد کہ گدھے سائز کا ایک بکرا خریدیئے، منڈی کا رخ کیجئے تو لومڑی سائز کا بھی خریدنے کے لئے بھی جیب اجازت نہیں دیتی۔ عجیب کشمکش اور ذہنی الجھن کا شکار ہوتا ہوں،

پچھلے سال تو اس قسم کے ایک عجیب حادثہ سے دوچار ہونا پڑا، میرے برخوردار سلمہ کے ایک ہمسن دوست کے یہاں ایک لمبا چوڑا بکرا آیا۔ وہ اور ان کے دوسرے یار دوست شام کو اسے ہار پہنا کر اور بچہ کا ٹکا پٹہ گلے میں ڈال کر ٹہلانے اور نمائش کرانے نکلے، پیچھے پیچھے داد طلب انداز میں دوردیر نظریں گھماتے ہوئے بچے کے والد صاحب بھی چل رہے تھے اور جگہ جگہ رک کر بکرے کا جغرافیہ لوگوں کو بتا رہے تھے، جی یہ ایک کوئنٹل سے کم کا نہیں ہے، اندازہ ہے کہ دس کلو سے کم تو چربی نہ نکلے گی۔ بڑی مشکل سے تیرہ سو پینتیس روپیہ میں سودا ہو پایا ہے، اپنا شوق ہے ورنہ اس گرانی کے دور میں اتنی مہنگی قربانی کون کرتا ہے، اور ساتھ میں یہ بھی کہ میاں سب اللہ واسطے ہے، اور میرا خیال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں قربانی کرے تو ایسی ہی، ورنہ بیکار ہے، محلہ کا معائنہ جب گھوم گھوم کر اس انداز میں نمائش ہو تو مجھ اور میرے برخوردار سلمہ کو کیسے

نہ علم ہو، خیر میری تو چھوڑیئے، مگر برخوردار کی بات سنیئے کہ وہ بضد ہو گئے کہ اس مرتبہ ایسا ہی بکرا اس سے بیس بکرا لیا جائے، تاکہ ان کو جواب تک طعنے سننے کے ملے ہیں انکا بھرپور جواب دیا جا سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے دوست نے چیلنج کیا ہے، کہ تمہارے ابا جان کسی قیمت پر ایسا بکرا نہیں خرید سکتے، وہ تو مریل قسم کا کوئی جانور لے آئیں گے، جو چھری پھیرنے سے پہلے صرف دہشت ہی سے دم توڑ دے گا۔

لہذا برخوردار کا اصرار تھا کہ اس کا جواب ضرور ہونا چاہیئے، نہیں تو میں گھر سے بھاگ جاؤنگا، اور آپ کو اپنی ڈھیر سی اولادوں میں سے ایک عدد سے ہاتھ ضرور دھونا پڑیگا، قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے لیئے یہ کس قدر سخت امتحانی مرحلہ تھا۔ لاکھ لاکھ سمجھایا کہ عزیزم! تمہارے فرمانبردار باپ کی چار ماہ کی تنخواہ سے بھی زائد اس کی قیمت ہے، پھر بھلا تمہارا باپ اپنے پائجامہ سے باہر کس طرح نکل جائے، مگر ان کا معاملہ تو یہ تھا کہ ؎

اس پہ مچلے تھے کہ ہم درد جگر دیکھیں گے

ایک طرف میں اپنے پڑوسی کی وجہ سے اس ذہنی کوفت میں گرفتار تھا دوسری طرف اپنے ان دوستوں پر رشک آرہا تھا جن کے یہاں خصی بکرے کی قربانی ناجائز ہے کیونکہ اس میں ایک عضو کم ہوتا ہے، لہذا وہ بھیڑوں کی قربانی کرتے ہیں، دیکھنے میں موٹے تازے، بالکل تر و تازہ، دو سو میں تین کے حساب سے خریدا، اور مع جبہ و دستار پیچھے سے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیدیا، اور ٹانگے لیئے چلے جا رہے ہیں، جب یہ منظر نظروں کے سامنے آتا تو یقین جانئے کہ بیساختہ

اپنے مولویوں پر تلاوت تبرا شریف کرنے کو دل چاہتا، جن کی کوتاہ بین نظریں
اتنی موٹی چیز بھی نہ دیکھ سکیں کہ خصی بکرے میں ایک عضو کی کمی ہوتی ہے، اور
قربانی کے جانور کے لیئے تو کوئی عضو کٹا پٹا نہ ہونا چاہیئے، چہ جائیکہ پورا عضو
غائب، اور یہ مولوی لوگ اس کو عیب ہی نہیں سمجھتے، یہ ساری الجھن ان ہی
مولویوں کی پیدا کردہ ہے، ورنہ اگر یہ لوگ بھی اس کو ناجائز قرار دیدیں تو پینٹھ
ستر میں اعلیٰ درجہ کے بھیڑے کی قربانی ہو جاتی، چاہے تھوڑی دیر کے لیئے اس کی
ٹانگوں میں ہاتھ دینا پڑتا یا گودی میں اٹھانا پڑتا۔

بہر حال یہ تو میرے احساس کی بات تھی اس سے برخوردار سلمہٗ کو کیا مطلب
وہ تو اپنی ضد پر اٹل رہے، بالآخر ان کو بہلانے اور کچھ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی
غرض سے میں پڑوسی ہی کے یہاں پہونچ گیا اور ان سے باادب کہا کہ میرے
بھائی آپ نے یہ کیا مصیبت کھڑی کر دی ہے، آپ تو خیر اللہ مبارک کرے اپنا
فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق ادا کر رہے ہیں مگر ہم جیسے
لوگوں کا کیا ہوگا؟ بچوں کی ضد کس طرح پوری کی جائے، بہر حال اب خریدنا تو
ہے ہی کچھ آپ ہی مدد کیجئے اور قرض روپیہ دیدیجئے، انشاء اللہ پچاس روپیہ
مہینے کے حساب سے ادا کر دونگا، پڑوسی سے چونکہ تعلقات خوشگوار تھے اسی
لئے ان سے بے تکلف بات کہہ دینے میں میں نے کوئی جھجھک نہیں محسوس کی،
مگر ایں..... یہ کیا ہوا؟ پڑوسی کا جواب سنکر تو میں سناٹے میں آگیا
وہ بولے۔ میاں بھائی، اب آپ سے کیا پردہ ہے، بچوں ہی کی ضد سے مجبور کر
میں نے بھی اتنا بڑا بوجھ اپنے اوپر لادا ہے میں آپ کو کیا قرض دوں جبکہ

صورت حال یہ ہے کہ ایک ہزار روپیہ لالہ جگن ناتھ کے یہاں سے سودی لایا ہوں. تب یہ جانور خریدا ہے مگر میں نے بھی سوچا اس مرتبہ ریکارڈ بن ہی جائے، برخوردار سلمہ تو گھر آتے آتے نارمل ہو چکے تھے، اور ان کی رائے تھی کہ اگر گنجائش ہو تو اپنی حیثیت کے مطابق کوئی جانور خرید لیا جائے، اور اگر گنجائش نہ ہو تو کسی بڑے جانور ہی میں حصہ لے لیا جائے. اور میں سوچ رہا تھا کہ مسلمان آخر کس کس طرح شریعت اسلامیہ پر ظلم ڈھائیگا، کیا واقعی اسی کا نام سنتِ ابراہیمی ہے؟ اور کیا یہی مطلوب قرآنی ہے؟

پچھلے سال کا قصہ تو خیر اس طرح تمام ہو گیا، مگر اب پھر بقر عید قریب آگئی ہے مجھے ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں اس مرتبہ کسی دوسرے پڑوسی کو بچوں کی خواہش پوری کرنے کی نہ سوجھ جائے کہ مجھے بھی اس میں گرفتار ہو کر کسی حادثہ کا شکار ہونا پڑے۔

قارئین دعا کریں کہ بقر عید خیریت سے گذر جائے۔

اندھے لوگ

مرزا دلدار بیگ کی چہرے کی شوخی اور آنکھوں کی چمک صاف طور پر اعلان کر رہی تھی کہ آج وہ بے حد خوش ہیں، میں نے کہا مرزا صاحب آج تو بڑے گلاگل نظر آرہے ہیں کیا کہیں رشتہ ٹھہر گیا؟ اتنا سنتے ہی تھوڑی دیر کے لئے مرزا صاحب کی ساری شوخی و طراری رفو چکر ہو گئی، اور ایک سرد آہ بھر کر بولے میاں کیوں ٹھٹھول کر کے جلے دل کو جلاتے ہو، یہ ارمان لئے تو قبر ہی میں چلا جاؤنگا، اور تم لوگ کوئی توجہ نہ کروگے،

میں نے مرزا صاحب کو پرسہ دینے کے انداز میں کہا۔ مرزا صاحب اس قدر مایوسی کی کیا ضرورت ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ پر ابھی سنجیدگی سے ہم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا ہے ورنہ آجکل لڑکیوں کی کیا کمی ہے ہر گھر میں دو، چار، پانچ والدین کو دو بھر ہو رہی ہیں، جنھیں وہ اونے پونے کھپانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، پھر آپ جیسا رشتہ جس گھر چلا جائے اس کی خوش نصیبی ہی ہے، بھلا ایسے لڑکے...... اتنا کہہ کر میں ذرا سا جھجھکا کہ کہیں مرزا صاحب چھوٹا منھ بڑی بات سمجھ کر برا نہ مان جائیں مگر وہ بڑے

موڈ میں میری بات سن رہے تھے، میرے خاموش ہوتے ہی بولے، کیوں کیوں کیا بات ہوئی، بریک کیوں لگ گیا اپنی بات پوری کرو۔ میں نے مرزا صاحب کے پرشوق چہرے کا جائزہ لے کر اطمینان کی سانس لی اور پھر کہا ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو کون ہاتھ سے جانے دیگا، جس لڑکی والے سے آپ چاہیں دوڑتے رشتہ کریگا، ویسے قارئین کی اطلاع کے لئے مرزا صاحب کا جغرافیہ بتا دیا جائے کہ مرزا صاحب کی عمر شریف ان کے اپنے بیان کے مطابق ستر سال کی ہے کہ ضعف جس کے پینتیس برس ہوتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ بعمر چالیس سال نزلہ کا شدید اٹیک ہوا جس کے نتیجہ میں تیس دانت شہید ہو گئے، دو داڑھیں جو بچ رہی تھیں، وہ بفضلہ تعالیٰ آج بھی صحیح سالم ہیں، بالوں کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے کہ آج کل تو تیس برس کی عمر کے لڑکے کے بال سفید ہونے لگتے ہیں پھر کیا انھیں بوڑھا کہہ دیا جائیگا، اور یوں بھی خضاب کی دریافت نے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے جسے وہ بوقت نکاح استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں، اور اگر ان کی نئی نویلی دلہن کی فرمائش ہوئی تو خضاب کے استعمال کو اپنی عادت بھی بنا سکتے ہیں، غرضیکہ مرزا صاحب ابھی اپنے کو ہر طرح شادی کے لئے فٹ قرار دیتے ہیں، اور اس وقت تو ان کا سینہ پھول کر ایک انچ آگے بڑھ آتا ہے، جب وہ کہتے ہیں کہ آج بھی اچھے سے اچھے زور آور جوان سے پنجہ ملانے کی سکت رکھتا ہوں، مالی پوزیشن کا معاملہ یہ ہے کہ چوروں اچکوں کے ڈر سے گھر میں برتن بھی صحیح سالم نہیں ہیں اور دو چار دوست احباب کے جمع ہو جانے پر ان کے لئے چائے کا اہتمام

کرتے وقت پڑوس کے مکان سے عاریتہً برتن منگواتے دیکھا گیا ہے یا پھر ہوٹل کے برتنوں سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا بیان ہے کہ وہ خاندانی رئیس ہیں اور ریاست کے ساتھ ساتھ شہر میں ان کی اور ان کے بزرگوں کی سخاوت کے بھی گھر گھر چرچے رہ چکے ہیں۔ تقسیم ہند اور پھر خاتمۂ زمینداری نے گو کہ ان کی کمر توڑ دی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ دس بیس ہزار کیلئے وہ کسی کے دست نگر بن سکیں، یہ الگ بات ہے کہ محلہ کے دوسرے بزرگوں کا کہنا ہے کہ مرزا صاحب کے والد بزرگوار بھی اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

بہر حال یہ تو بقول غالبؔ مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تھی کہ مرزا صاحب کی شادی اور ان کے جغرافیہ کی باتیں ہونے لگیں، ورنہ مجھے تو اس وقت مرزا صاحب کی اس مسرت کا راز بتانا تھا، جو شادی کے ذکر سے پہلے اور اس ذکر کے بعد انکے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

شادی کے ذکر سے مرزا صاحب کے چہرہ پر جس کرب و بےچینی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے وہ میرے اس قول و قرار کے بعد پھر مسرت میں تبدیل ہو گئے کہ جلد ہی آپ کیلئے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر کے آپ کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

جب مرزا صاحب نے اپنے مسوڑھوں کو باہر نکال کر یا دوسرے لفظوں میں بھیانک انداز میں مسکرا کر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا تو میں پھر اپنے اصلی سوال کی طرف لوٹا کہ مرزا صاحب آج آپ غیر معمولی طریقہ پر خوش کیوں ہیں، آخر بات کیا ہے؟ مرزا صاحب نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنی گردن کو پھلیندرے کی

ٹھیٹھی کی طرح زور زور سے ہلانا اور مسکرانا شروع کر دیا پھر اچانک یوں گویا ہوئے
برخوردار آج آئے تو تھے بڑے موڈ میں، مگر تم نے غزل کا ذکر غیر شاعرانہ
انداز میں چھیڑ کر کوفت میں بتلا کر دیا تھا، خیر ہوئی کہ تم کو جلدی ہی ہوش آگیا، اور اپنے
لنگوٹیا یار کے سلسلے میں اپنے فرض کا احساس کرلیا، لنگوٹیا یار کے استعمال پر میں
بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا، پھر انھوں نے کہا خیر چھوڑو اس ذکر کو، سنو مجھے
آج تم سے ایک بہت اہم بات بتانا ہے جس کو ایک سوال میں سمجھو، بتاؤ تو بھی
کہ سنی لوگ اندھے کیوں ہوتے ہیں، یعنی کہ ان میں نابینا لوگ کیوں پائے جاتے ہیں؟
میں مرزا صاحب کے اس سوال پر واقعی گھبرا گیا، میری سمجھ میں نہیں آرہا
تھا کہ خاص طور پر سنی لوگوں کے نابینا ہونے کی کیا وجہ بتادوں، جبکہ ہر مذہب
اور ہر قوم میں نابینا لوگ پائے جاتے ہیں، میری اس گھبراہٹ کو مرزا صاحب
نے تاڑ لیا، فخر و مسرت سے ان کا چہرہ کھل اٹھا، اور ان کے ٹوٹے مکان کی
باقی ماندہ دو اینٹیں یعنی انکی دونوں داڑھیں جھانکنے لگیں۔ مجھے بے بس
پاکر مرزا صاحب نے بڑے پرجوش انداز میں کہا، اپنے مولویوں سے پوچھو، اگر
وہ جواب دے سکیں تو ٹھیک ہی ہے ورنہ کہو تو میں ہی وجہ بتا دوں،
قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس فلسفیانہ سوال کا جواب دریافت
کر لینے کی مجھے کتنی جلدی رہی ہوگی، چنانچہ میں نے کہا مرزا صاحب بھلا مولوی
لوگ اس سلسلہ میں کیا بتا سکیں گے۔ یہ تو آپکی اپنی تحقیق سے متعلق بات ہے
اب آپ ہی اس سوال کا جواب بھی مرحمت فرمائیے۔
مرزا صاحب نے اپنی ناک کو پچکتے پھولتے غبارے کی طرح پھڑپھڑاتے

کے بعد گرد و پیش کا جائزہ لیا، اور بڑے فاتحانہ انداز میں زیر لب مسکی مارتے ہوئے فرمایا! عزیزم بات یہ ہے کہ سنیوں میں لوگ حافظ قرآن ہوتے ہیں اور غلط سلط قرآن مجید پڑھتے ہیں، اس لئے اللہ پاک ان کی آنکھوں کی روشنی چھین لیتا ہے اور وہ نابینا ہو جاتے ہیں۔

مگر مرزا صاحب! میری زبان سے اتنا ہی نکلا تھا کہ مرزا صاحب جھپٹ پڑے۔ اور فرمایا بس بس اب اگر مگر کی کچھ گنجائش نہیں ہے صحیح بات کو مان لیا کرو، سلامتی اسی میں ہے، اور میں بھونچکا ہو کر ان کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہ گیا، سنیوں میں وہ لوگ بھی تو نابینا ہوتے ہیں، جو حافظ قرآن نہیں ہوتے، شیعوں میں نابینا لوگ کیوں پائے جاتے ہیں، شیعہ سنی کے سوا دوسرے مذاہب میں لوگ کیوں نابینا ہوتے ہیں؟ اس قسم کے کتنے ہی سوالات میری زبان پر آنے کے لئے بےچین تھے، مگر مرزا صاحب اپنی بات کہہ کر یہ جا اور وہ جا۔

تیسرے دن مجھے مرزا صاحب سڑک پر نظر آئے، وہ ایک جنازہ میں شریک تھے، جنازے کے آگے آگے ایک صاحب دو آدمیوں کے سہارے شارع عام پر سورۂ رحمٰن کو معدہ کی گہرائیوں سے پڑھتے ہوئے چل رہے تھے، ہر آیت انکی طبع آزمائی کا شاہکار، خصوصاً فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن کا تلفظ اس بات کی واقعی تصدیق کر رہا تھا کہ قرآن کو واقعی جان بوجھ کر غلط پڑھنے سے آنکھوں کی روشنی سلب ہو سکتی ہے۔

مگر ان قبلہ وکعبہ کے نابینا ہونے کی وجہ سمجھ میں نہ آسکی جن کا سہارا خود

مرزا صاحب بھی بنے ہوئے تھے، مرزا صاحب کو تو خیر اس دن کیا اس کے بعد بھی دو چار دن نہیں آنا چاہیئے تھا، مگر اسی روز شام کو میں نے مرزا صاحب کے در دولت پر حاضری دی اور دریافت کیا کہ وہ جنازہ کس کا تھا، تھوڑی دیر واجبی گفتگو کرنے کے بعد میں نے اپنی الجھن ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ مرزا صاحب جہاں تک آگے والے صاحب کے نابینا ہونیکا معاملہ ہے تو وہ تو سمجھ میں آگیا، کیونکہ آپ کے فارمولے کے حساب سے تو وہ سو فی صد صحیح ہے، ان کو سورۂ رحمٰن زبانی یاد بھی ہے اور وہ اس کو غلط سلط پڑھتے بھی ہیں، لہٰذا ان کو تو نابینا ہونا ہی چاہیئے تھا، مگر پیچھے والے صاحب کے نابینا ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آئی، کہیں ایسا تو نہیں کہ قرآن کا انکار کرنے اور قرآن کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی سزا میں آنکھ اندھا کر دیا گیا ہو؟

میرے اتنا کہتے ہی مرزا صاحب چراغ پا ہو گئے، اور اپنی آنکھ، ناک، داڑھی اور پیشانی سے غصہ نشر کرتے ہوئے اور منھ سے جھاگ اڑاتے ہوئے ارشاد فرمایا، دیکھو اپنی زبان کو سنبھال لو، بھلا ایسے قرآن کو جس میں جگہ جگہ تحریف ہو گئی ہے، کمی اور زیادتی ہو گئی ہے، اور پورے دس پارے کم کر دیئے گئے ہیں ہم کیا یاد کریں اور اس پہ کیا اعتماد کریں، یہ کوئی جرم تو نہیں کہ ناقابل اعتبار چیز کو ناقابل اعتبار کہہ دیا جائے۔ قبلہ وکعبہ کی آنکھیں تو ایک بیماری میں گئی ہیں، ورنہ پہلے تو وہ بینا تھے۔

میں نے کہا قرآن کے قابل اعتبار اور مکمل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسکی معجزانہ شان آج بھی باقی ہے، وہ اسی کو یاد ہو پاتا ہے جو اس سے

عقیدت رکھے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی شیعہ حافظ نہ ہو سکا، اور نہ آئندہ ہو سکیگا، اگرچہ کوشش بہت کی کہ یہ داغ دھل جائے، چنانچہ سنی حافظوں کو مختلف قسم کی لالچیں دیکر شیعہ بنانے کا تجربہ بھی کیا، مگر ہر کوشش ناکام رہی، اور یہ خدا کے مکمل اور قابل اعتماد کلام کا معجزہ ہی ہے کہ اگر کسی سنی حافظ نے شیعت قبول کر لی تو اسکے قلب سے قرآن مٹ گیا اور وہ عام شیعوں کی طرح ہو کر رہ گیا۔

مرزا صاحب میری کھری کھری سن کر تلملا گئے اور بڑے جوش کے ساتھ کہا کہ اچھا اگر تم لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے تو ہم اپنی قوم سے ایک لڑکے کو حفظ کرا کے دکھا دیں گے، تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ہم حفظ کر تے نہیں یا قرآن حفظ ہوتا نہیں، میرے اور مرزا صاحب کے درمیان چھ مہینے کی مدت مقرر ہوئی تھی کہ اس دوران لڑکا جو کچھ حفظ کریگا، اسی کا امتحان ہو جائیگا، اور اسی پر فیصلہ ہو جائیگا اس کہا سنی کو پانچ ماہ گزر چکے ہیں، ادھر میں بھی غافل نہیں ہوں، جس لڑکے کو مرزا صاحب نے اس امتحان کے لئے پیش کرنے پر آمادہ کیا تھا وہ راہ فرار اختیار کر چکا ہے، اب یہ خبریں سننے کو مل رہی ہیں کہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی مرزا صاحب کا انتقال فرما لینے کا ارادہ ہے، اور میں حیران ہوں کہ مرزا صاحب اتنے غیرت مند کیسے ہو گئے، دیکھئے آنے والا مہینہ ہی اس کا فیصلہ کر سکے گا...

پڑھے لکھے یا جاہل

لوگ کہتے ہیں کہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو، میں کہتا ہوں، نہیں صاحب میں جاہل آدمی ہوں، اس سلسلہ میں دونوں فریق اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں لوگ جو کچھ کہتے ہیں ان کو وہی کہنا چاہیئے، کیونکہ میری ظاہری وضع قطع اور شکل و صورت کا یہی تقاضہ ہے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ مجھے کہنا چاہیئے، کیونکہ اگر میں پڑھا لکھا ہونا تسلیم کر لونگا، تو پھر کچھ دن کے بعد یہ تقاضہ کیا جائیگا کہ اب آپ اپنے اور ہمارے دعوی کو ملا کر تسلیم کر لیجیئے، مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہونگے، حاصل جوڑ آئے گا۔ "پڑھے لکھے جاہل"، اور یہ مخلوق اس کثرت سے آجکل پائی جاتی ہے کہ اگر میں بھی یہی ہو گیا تو میرے سارے منصوبوں اور کارناموں پر پانی پڑ جائیگا، مجھے اپنی حقیقت معلوم ہے اس لئے پڑھے لکھے آدمی کی حیثیت سے اپنا کوئی امتیازی مقام بنا لینے کی اس صدی میں مجھے کوئی امید نہیں ہے، لہذا جاہل آدمی کی حیثیت سے اپنے کو متعارف کرانے میں میں اپنی خیریت سمجھتا ہوں ساتھ ہی یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ شاید کبھی مجھے بھی کوئی امتیازی مقام مل جائے، اگر کہیں پڑھائی لکھائی کی بات آجاتی اور موقع اس کا ہوتا ہے کہ بغیر

پڑھا لکھا بنے کام نہ چلے گا، تو میں اپنا تعارف یوں کراتا ہوں کہ فلاں فلاں مدرسوں اور فلاں فلاں کالجوں کو پاس کر چکا ہوں۔

عام حالات میں میرے اس فرمان سے ایک دھاک بیٹھ جاتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت قابل آدمی ہے، میں بھی کچھ غلط نہیں کہتا ہوں، واقعی ان مدرسوں اور کالجوں کے پاس سے ایک دو مرتبہ نہیں دسیوں مرتبہ گذر چکا ہوں پھر اگر یہ کہتا ہوں کہ ان کو پاس کر چکا ہوں تو کیا غلط بیانی کرتا ہوں؟

آپ کہیں گے تو پھر تم یہ دورخی چل کر فریب کیوں دیتے ہو، اگر واقعی پڑھے لکھے ہو تو اپنے کو پڑھا لکھا ظاہر کرنے میں تو اچھائی ہی ہے اور اگر پڑھے لکھے نہیں ہو تو ایسے طور طریقے کیوں اختیار کرتے ہو جس سے لوگ تم کو پڑھا لکھا سمجھیں؟ اور پھر آپ کے دل میں بھی یقیناً تشویش پیدا ہوگی، کہ واقعی میری حقیقت ہے کیا؟ پڑھا لکھا ہوں یا جاہل؟ تو لیجئے سنیئے بات دراصل یوں ہے کہ ہوں تو کچھ پڑھا لکھا یعنی اتنا کہ جاہل نہیں کہلا سکتا ہوں، مگر دیکھئے یہ راز کی بات ہے کہیں آپ سب سے بتا نہ دیجئے گا، کیونکہ اس دور میں پڑھائی لکھائی کے تقاضے بدل چکے ہیں، اگر میرا کسی زمانے میں کسی کالج کا طالب ہونا ثابت ہوگا تو پھر یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ میں نے ہڑتالوں میں حصہ لیا ہوگا، کالج میں توڑ پھوڑ کی ہوگی، جلوس نکالے ہونگے، اپنے استادوں کو گالیاں دی ہونگی، اور پرنسپل صاحب کو انکے آفس سے کھینچ کر انکی گوشمالی کی ہوگی، اگر یہ سب کچھ تسلیم کر دوں تو رسوائی ہے اور نہ تسلیم کروں تو آپ مجھے جھوٹا قرار دیکر میرے طالب علم رہنے کا انکار کر دیں گے زیادہ کھیل اور محبت کرونگا تو مٹھوس اور وحشی کہلاونگا، خیر یہاں تک تو جیسی تیسی

گذر جائیگی، مگر پڑھنے کے بعد کے مشاغل کے بارے میں اگر میں یہ بتاؤں گا کہ "البدر" جیسے مذہبی رسالہ میں ملازم ہوں تو یقیناً پڑھا لکھا جاہل کہلاؤں گا۔ جو مجھے کسی حال میں بھی منظور نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ صرف پڑھا لکھا کہلاؤں یا صرف جاہل۔

پچھلے ہفتہ جو حادثہ پیش آیا، اس نے میرے خیال کو مزید تقویت بخشی، اور میں اور بھی زیادہ زور و شور سے اپنے کو صرف جاہل کہلانا مناسب قرار دے رہا ہوں، ہوا یہ کہ اپنی ایک ضرورت سے میں لپکتا جھپکتا چلا جا رہا تھا کہ میرے قریب سے ایک رکشہ گذرا، جس پر اپنے پرانے دوست جاوید صاحب براجمان تھے، رکشہ کچھ دور بڑھ کر رک گیا، میں نے پلٹ کر دیکھا، جاوید صاحب اپنے بازو وا کئے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے، کچھ وہ بڑھے، کچھ میں بڑھا، سلام مصافحہ اور پھر معانقہ ہوا، لمبے عرصے کے بعد جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، کسی زمانے میں وہ اپنے کلاس فیلو ہوا کرتے تھے (گستاخی معاف! واقعہ کے بیان کے لئے میں نے یہ لکھ دیا ورنہ میں ہوں جاہل ہی) بڑی بے تکلفی تھی، ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، اور کبھی کبھار سیر و تفریح بھی!! اب جو اتنے عرصے کے بعد جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کے مشغلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، ساتھ ہی میں نے شکوہ کیا کہ تم نے بالکل فراموش کر دیا، کہیں دکھائی بھی نہیں پڑتے ہو، اس کے جواب میں انھوں نے نہایت ہی فخریہ انداز میں کہا، کہ ہاں بھائی تم تو میرے مزاج سے واقف ہو، شروع ہی سے ڈرامہ وغیرہ کا شوق رہا، اکثر پروگراموں میں شرکت بھی کیا کرتا تھا، ایسے ہی ایک ڈرامہ میں شرکت

کے لئے بمبئی جانا ہوا، پروگرام بہت کامیاب ہوا، اور میں فلم انڈسٹری میں لے لیا گیا۔

میں نے کہا کیا کہا؟ فلم انڈسٹری میں لے لئے گئے، یعنی اب مستقل یہی کام ہوا کریگا، اور دوکان بند کر دی؟ بولے ہاں دوست! اب تو بہت مزے ہیں دعا کرو کہ کامیابی ہو جائے، اگر چل نکلا تو ایسی ایسی دوکانیں تو روز بنیں بگڑیں گی، کہو تم کو خوشی ہوئی؟

میں جاوید صاحب کے اس سوال پر چکرا سا گیا، ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ انھوں نے میرے شانے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے نہایت ہی جوش کیساتھ کہا، میرے یار تم کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ تمہارا دوست اتنا کامیاب ہوا، کچھ دن میں میرا نام بچے بچے کی زبان پر ہوگا، اور اس وقت تم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکو گے کہ یہ میرا بچپن کا دوست ہے، جاوید صاحب خوش تھے واقعی بے حد خوش، اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے ساتھ میں بھی خوش ہو جاؤں، مگر مجھے افسوس ہے کہ میری خوشی رسمی ہی سی رہی، یعنی اخلاقاً میں نے دانت تو کھول دئے، مگر بغیر آئینہ دیکھے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میرا چہرہ ہنسی سے زیادہ رونے کے قریب رہا ہوگا اور غالباً جاوید صاحب نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ میں ہنس نہیں رہا ہوں، ان کو منھ چڑا رہا ہوں، اسی لئے انھوں نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے مجھ سے پوچھا، تم کیا کر رہے ہو آجکل؟ میں نے کہا کاکوری سے ایک رسالہ نکلتا ہے "البدر" اسی کا فکاہی کالم لکھتا ہوں۔ کب سے نکل رہا ہے یہ رسالہ؟ جاوید صاحب نے پوچھا، میں نے کہا تقریباً پونے دو سال سے، اور یہ

کہتے کہتے البدر کا تازہ شمارہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

جاوید صاحب نے جلدی جلدی ورق گردانی کی، آئینہ کی دو چار سطریں کہیں کہیں سے پڑھیں، اور اس کے بعد ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولے! یار یہ مولوی ملاؤں کی جھول جھال میں تم کہاں پڑ گئے، یہ سب کام انھیں لوگوں کے لئے چھوڑ دو، کیا تنخواہ دیتے ہوں گے یہ لوگ تم کو، کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری اُردو شروع ہی سے اچھی ہے، مجھے یاد ہے کہ کالج کے سالانہ پروگرام میں تم نے اپنا انشائیہ "مجھے غالب سے نفرت ہے،" جب پیش کیا تھا تو کیسا سماں بندھا تھا، اور اب تو اتنے دنوں میں تم اردو بھی اچھی لکھنے لگے ہو گے، پھر کیوں نہ اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ، چلو میں تمہارے لئے کوشش کروں، اور تم بھی فلم انڈسٹری میں آجاؤ۔ پیسہ بھی ملے گا اور آرام بھی، نام کماتے میں ہو گا۔

لیکن جاوید سنو، میں نے کہا، کیوں نہ ہم اور تم دونوں مل کر ڈاکوؤں کا ایک گینگ بنالیں، دن میں شریفوں کی طرح زرق برق کپڑے پہن کر گھومیں، اور رات میں ڈکیتیاں ڈالیں، اس طرح پیسہ بھی خوب ملے گا، آرام بھی ملے گا، اور نام کے تو کیا کہنے ہیں۔

جاوید صاحب نے پھٹی پھٹی نظروں مجھے گھورتے ہوئے کہا، تمہارا بھیجہ بالکل سٹر گیا ہے بھلا ڈکیتی کہیں شریفوں کا پیشہ ہے اور تم ڈکیتی کیسے ڈال سکو گے۔ اس کے لئے بھی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے کہا، اور وہ کام جو تم بتا رہے تھے وہ بھی اسی ٹائپ کا ہے، اس میں اس سے زیادہ محنت

پڑے گی۔ رہ گیا شریفوں کے پیشہ کا معاملہ تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قلم سے زیادہ آجکل کے شریفوں کا محبوب مشغلہ ڈکیتی ہی ہے میاں یہ ماڈرن ایج ہے آجکل ایسی ٹیکنک ایجاد ہوگئی ہے کہ کرو ڈکیتی اور کہلاؤ ساہوکار، اور تو اور اب تو لکھے ہوئے آرٹیکل پر بھی ڈاکہ پڑنے لگا ہے ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے کہ ایڈیٹر البدر کا ایک مکمل آرٹیکل ایک صاحب نے ڈاکہ مار کر ایک روزنامہ میں دوسری سرخی لگا کر چھاپ دیا، خیر سے وہ اپنے کو ڈاکٹر بھی لکھتے ہیں، معلوم نہیں کہ منجنی ڈاکٹر ہیں کہ چوہا مار، بہر حال ان بھلے مانس نے پورا آرٹیکل عنوان بدل کر اپنے نام سے شائع کرا دیا، جب لوگوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار کی، تو آٹھ دس روز کے بعد ایک خبر شائع کرا دی کہ وہ آرٹیکل میرا تھا، میرا ہے، میرا رہے گا، یعنی کہ دوسرے لفظوں میں ایڈیٹر البدر نے ان کے ذہن نارسا سے چوری کی تھی، کیا سمجھے آپ، ہے نا بڑھیا دھندا۔ چلو "ڈاکٹر صاحب" سے مل کر اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کر لیں، اور پھر قینچی اور دوسرے اوزار بازار سے خرید لائیں، بس کام فٹ سمجھو، دیکھو تو سندر ڈاکو کا کتنا نام ہوا، کیا پتہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں ہم لوگ بھی اسی طرح نام پیدا کر لیں۔

میں تو سمجھا تھا کہ میری باتیں سنتے ہی جاوید صاحب کی باچھیں کھل جائیں گی، اور وہ مارے مسرت کے مجھے گلے سے لگا لیں گے، مگر وہاں تو الٹا ہی اثر ہوا۔ جاوید صاحب روٹھ کر چل دیئے، اور جاتے جاتے انھوں نے کہا "تم پڑھے لکھے جاہل ہو۔ تم کو سمجھانا اور پتھر سے سر ٹکرانا برابر ہے، جاؤ تمہارے

مقدر میں ٹھوکریں ہی ہیں، تمہارے نصیب میں تو البدرگی ملازمت اور مولوی ملاؤں کا ساتھ ہے۔ پھر تم کہاں اوپر اٹھ کر سوچ سکتے ہو۔

اے ناظرین با تمکین ان حالات میں اگر میں اپنے کو جاہل کہتا ہوں تو کیا بے جا ہے کیونکہ اس طرح پڑھے لکھوں کی عزت تو محفوظ ہے ورنہ میرے جیسے لوگ۔ تو پڑھے لکھے جاہلوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہی رہیں گے۔

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

میرے جی میں آتا ہے کہ ایمپلائمنٹ ایکسچنج کے دفتر میں آگ لگا دوں، تمام ملازم پیشہ لوگوں سے خوب لڑائی لڑوں اور ملازمت طلب کرنے والوں کے خلاف زبردست مہم چلاؤں، اور پھر ملازمت کے خلاف جد وجہد کرتے کرتے جان دیدوں، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ردِ عمل ہے اس دوسالہ دورِ ملازمت کا" جو آنریبل ایڈیٹر البدر کی ماتحتی میں بحیثیت ایک ملازم کے گذارا ہے، میرا یہ خیال ہے کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، اس دو سال کے عرصہ میں ایڈیٹر البدر کے برتاؤ سے میں یہ سمجھا ہوں کہ ملازم نام ہے ایک ایسی مشین کا جو ہر وقت چلتی رہتی ہو جس کے کل پرزوں کو آرام کی قطعی حاجت نہ ہو، اور یہ بالکل صاف اور کھلی بات ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے بھلا مشین جیسی حقیر چیز میں تبدیل ہونا کیسے گوارہ کریگا، اور اگر وہ گوارہ کریگا تو یہ اس کی شدید ترین ذلت ہے، اور ایسی زندگی ذلت کی زندگی ہے جس سے عزت کی موت بہر حال بھلی ہے؛ ایڈیٹر البدر نام ہے ایک انسان نما مشین کا۔ وہ چلتے رہتے ہیں، وہ حرکت کرتے رہتے ہیں، وہ سفر میں ہوں یا وطن میں، ان کا لکھنے پڑھنے کا سامان ہر جگہ

ان کے ساتھ رہتا ہے اور ذرا سا موقع ملتے ہی ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا قلم نظر آنے لگتا ہے، خدا گواہ ہے کہ میں نے ان کے عزیز ترین دوستوں کو شکوہ کرتے سنا ہے کہ اب تم دوستی کے قابل نہیں رہ گئے، ہر وقت کتاب کا غذ اور قلم کے چکر میں پڑے رہتے ہو، آپ کی اطلاع اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آج آپ کو یہ اطلاع بھی دے رہا ہوں کہ ایڈیٹر البدر کی اہلیہ کو بھی اس بات کی شکایت ہے کہ وہ ان کو کما حقہ وقت نہیں دیتے، گھر پر رہ کر بھی وہ ان سے اور بچوں سے بات کرنے کے مقابلہ میں لکھنے پڑھنے میں وقت گزارنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں،

ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس شخص کی زندگی خود ایسی مشینی ہو، وہ بھلا اپنے ماتحتوں سے کیا چاہے گا، نتیجہ سامنے ہے کہ اس دو سالہ دور میں سکون و اطمینان تو جیسے خواب و خیال بن کر رہ گئے۔

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے، کہ آج یہ میاں مردم شناس کو ہو کیا گیا ہے، جو اس طرح آنریبل ایڈیٹر البدر کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے جبکہ اس کی قسمت میں راوی چین ہی لکھتا ہے، تین سو روپئے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور تین چار صفحوں کا ایک آئینہ لکھ کر دے دیتا ہے بس!۔ اس کے بعد آرام ہی آرام، اوپر سے غزا رہا ہے کہ سکون و اطمینان خواب و خیال بن کر رہ گئے، اب اس سے زیادہ آرام کی ملازمت اور کون مل سکتی ہے؟

مگر اے ناظرین با تمکین! ذرا یہ بھی تو سوچئے نہ کہ آخر کسی بھی ملازم کے کام کا کوئی وقت تو ہوتا ہی ہے، مگر ہمارے ایڈیٹر صاحب کے یہاں نہ رات رات ہے

اور نہ دن دن، ابھی اس ماہ میں سردی کا جو سکنڈ اٹیک یعنی کہ دوسرا حملہ ہوا ہے
اس سے کون واقف نہیں ہے لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ ایسی برفیلی اور سردیلی راتیں
تو دسمبر اور جنوری میں بھی نہیں گذریں۔ جو سردی کے اصل مہینے ہیں، انھیں سرد
راتوں میں سے ایک رات کا ذکر ہے، رات کی سیاہی ختم ہو چکی تھی، مگر ابھی
سونے کا وقت بہرحال باقی تھا، میں میٹھی نیند سو رہا تھا اور سپنوں میں حسین
شیش محل تعمیر کر رہا تھا کہ اچانک ایک بھونچال کی شکل میں اہلیہ نے میرا لحاف
ہٹا کر مجھے اس طرح جھنجھوڑنا شروع کیا جیسے بیر کی ٹہنی ہلائی جا رہی ہو، میں نے
ہڑبڑا کر آنکھ کھول دی، اہلیہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھیں میں ابھی
ٹھیک سے ماحول کا جائزہ بھی نہ لے سکا تھا کہ اہلیہ نے خبر سنائی، فاروقی بھائی
آپ سے ملنے آرہے ہیں، اتنا کہتے ہی اہلیہ یہ جا اور وہ جا۔ میرے منھ سے نکلا
یہ فاروقی بھائی نام کا جن میرے اوپر عجیب مسلط ہوا ہے، ابھی نہ جانے اپنی میٹھی
نیند کی قربانی پر اور سپنوں کے حسین شیش محل کی مسماری پر کس کس انداز میں
ماتم کرتا کہ السلام علیکم کہتے ہوئے ہمارے ایڈیٹر نامدار داخل ہوگئے، اور مجھے
دیکھتے ہی غرائے۔ ہائیں ابھی تک تم پڑے سو رہے ہو، کاہل آدمی ہو، ارے
کچھ تو خدا کا خوف کرو، فجر کی نماز ہو چکی، اور تم ابھی تک بستر پے لیٹے پڑے ہو،
میں نے جھٹ جوابی حملہ کیا، اجی حضرت، فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تلاوت قرآن مجید
کرنا چاہیئے، یہ نہیں کہ نماز فجر ادا کرتے ہی دنیا کے کام دھندوں میں لگ جایا
جائے، میرا حملہ ظاہر ہے کہ فاروقی بھائی ہی پر تھا، جو نماز فجر کے بعد سیدھے میری
زیارت کے لئے تشریف لائے تھے۔ جواب میں فرمایا خدا کا شکر ہے کہ میں نے

نماز فجر بھی با جماعت ادا کی ہے اور مسجد سے یہاں تک چلتے ہوئے نصف پارہ کی تلاوت بھی کر لی ہے اپنی خبر لو کہ ابھی تک پڑے ہوئے نحوست پھیلا رہے ہو۔ اٹھو اور اٹھ کر جلدی سے نماز ادا کرو، وقت تنگ ہو رہا ہے، میں کسی فرمانبردار نوکر کی طرح اٹھا۔ جلدی جلدی نماز ادا کی، اور باورچی خانہ کی طرف چلا آیا، مجھے معلوم تھا کہ آج اہلیہ کی مسرتوں کا کچھ ٹھکانا نہ ہوگا، آج ان کے پیر و مرشد کا صبح صبح ورود ہوا ہے، اہلیہ نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، کہئیے آج یہ صبح صبح کیسے ادھر آنا ہوا، اور اس مسکراہٹ پر میرا جی چاہا کہ اہلیہ کے ہاتھ سے بیلن چھین کر اپنا سر پھوڑ لوں، مگر بات بڑھ جانے کے خوف سے اپنے تین کلومیٹر فی منٹ کے رفتار سے آتے ہوئے غصہ کو لوٹا دیا، اور مکمل صبر و سکون کے ساتھ کہا، اے نیک بخت تجھے کیا ہو گیا ہے کہ ایک معمولی غیر مرد کی وجہ سے تو اپنے ایسے نامی گرامی اور قابل احترام شوہر کی ناقدری کرتی ہے، اہلیہ نے بڑے تیکھے انداز میں جواب دیا، کہ میں بھلا ناقدری کیوں کرنے لگی، ہاں مجھے فاروقی بھائی کی کبھی کبھار آمد سے مسرت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں آپ سے کچھ نیک کام کرا لیتے ہیں، جس پر ہزار کوششوں کے باوجود میں قابو نہیں پا سکتی، اب ابھی دیکھئے آتے ہی آپ سے فجر کی نماز ادا کرا لی، میں سردی سے کانپ رہا تھا، میں نے کہا، اچھا اب اس موضوع پر گفتگو بعد میں ہوگی، جلدی سے چائے بنا کر بھیجو، یہ کہتا ہوا میں پلٹ کر فاروقی بھائی کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان کی صبح صبح ان کے ورود مسعود و نا محمود کا سبب دریافت کرنے لگا۔

اتنے میں چائے مع لوازمات آ گئی۔ فاروقی بھائی نے خاص اڈیٹرانہ

انداز میں کہا، ارے بھائی اس کی کیا ضرورت تھی میں تو جلدی جلدی دو باتیں کرنے آیا تھا، ناشتہ تو گھر میں تیار ہی ہو رہا ہوگا، تم نے بیکار تکلف کیا اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میرا بس چلتا تو تم کو ایک پیالی چائے کے لئے بھی نہ پوچھتا، یہ تو گھر والی ہی ہے جس پر تمہارا جادو چل رہا ہے اور وہ دل سے تمہیں پیر و مرشد سمجھ کر تمہارے کھلانے پلانے کو عین ثواب تصور کرتی ہے مگر دل کی بات زبان پر تو لا نہیں سکتا تھا، بس یوں ہی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ عرض کیا ارے یہ بھی کیا، صرف چائے ہی تو ہے، اور چائے کا تو وقت ہی ہے۔ فاروقی بھائی نے ایک پیالی چائے بنائی، اور گھونٹ بھرنے لگے، چائے کے دوران ہی انھوں نے لکھنؤ کے تبرائی مشن کے ترجمان ماہنامہ "الواعظ" کا نومبر ۸۴ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں یہ کہتے ہوئے تھمایا۔ "تمہارے لئے یہ تحفہ لایا ہوں، کئی مہینوں سے تم اس کے دیدار کو ترس رہے تھے، مگر یہ سمجھ لینا یہ تم کو مستقل مطالعہ کے لئے دستیاب نہ ہو سکے گا۔ جہاں اس کے مقالات کے جوابات شائع ہوئے فوراً ہی تبادلہ بند ہو جائیگا۔ جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے، وہ تو میں نے البدر کے جنوری کے شمارہ میں لکھ دیا تھا کہ "الواعظ" نے کتمان مذہب کے فریضہ پر عمل کرتے ہوئے تبادلہ بند کر دیا۔ اس لئے یہ شمارہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں بھیج دیا گیا ہے میں نے کہا نہیں، قبلہ یہ رسالہ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اگر آپ اس کے مضامین کا جواب دے سکتے ہوں تو دیں۔

فاروقی بھائی بولے اگر ایسا ہی ہے تو اسی وقت کیوں نہ بھیجا گیا، جب یہ شائع ہوا تھا، یہ کئی مہینے توقف کے بعد کیوں بھیجا گیا، اچھا خیر چھوڑو اس بحث

کو، تم اس پر غور کر لو، اور اگر مناسب سمجھو تو کچھ اس سلسلہ میں لکھ بھی دو، یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرے سامنے مدؔ کھول کر رکھ دیا۔ میں نے سرسری نظر اس پر ڈالنا شروع کی، ۱۲، ۱۴ سطروں کے بعد لکھا تھا۔

"اور آج بھی علمائے فرنگی محل اکثر شیعوں کے یہاں مجالس و محافل میں نیز دیگر تقاریب میں شریک نظر آتے ہیں، جس سے سابقہ روایات کی تصدیق ہوتی ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ پیروان شیخ نجدی مولانا عبدالشکور اور ان کے بعض افراد خاندان اور چند ہمنوا (جو نہ صرف شیعوں کے دشمن ہیں بلکہ اہل سنت وجماعت کے بھی مخالف ہیں) کو کبھی شیعہ سنی کا میل جول نہیں بھایا۔"

چند سطروں کے بعد نظر ان جملوں پر رک گئی۔

"چنانچہ آج بھی مولانا عبدالشکور صاحب کا پوتا ایک جدید رسالہ البدر کا اجراء کر کے اس پُر شرارت پالیسی پر عمل کر رہا ہے"۔

اور اس پر مغز اداریہ کا اختتام ایک دھمکی پر ہوا ہے جس کی زبان کی لطافت سے لطف اندوز ہونے کے لئے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"آخر میں ہم یہ دوسری بار البدر کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ غلط حرکت اور اسلام دشمن پالیسی سے فوراً باز آجائے، ورنہ الواعظ تمہارے اوپر نفاق کے پڑے ہوئے پردے کو نوچ کر دنیا کے سامنے بے نقاب کر دے گا"۔

میں نے فاروقی بھائی کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اداریہ کو کئی مرتبہ غور سے پڑھا، مگر میری سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر ایڈیٹر الواعظ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں نے یہ سمجھ کر کہ شاید اس میں کوئی خالص علمی اندازِ نگارش اختیار کیا گیا ہے فاروقی بھائی

سے کہا، اس پر تو کچھ تبصرہ آپ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ اس میں آپ ہی کے متعلق اور امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے متعلق کہا گیا ہے، لہذا اسے آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ فاروقی بھائی بولے، میاں امام اہلسنتؒ شیعوں کے اعصاب پر مسلط ہیں، انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے انھوں نے شیعیت کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ کر تبرا مشن کو مفلوج کر دیا ہے اور آج تبرائیوں کے لئے ان کا نام وہی حیثیت رکھتا ہے جو شیطان کے لئے لاحول۔ اس لئے اگر یہ حضرات ان کو برا بھلا کہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ رہا میری ذات کا معاملہ تو تم ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ ع

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اے ناظرین با تمکین!۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم بھلا اس اداریہ پر کیا تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جس کی حقیقت صرف اتنی ہو کہ ؎

لگے اب منہ چڑانے دیتے دینے گالیاں مجھ کو ۔ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

ہاں ہم کو ایڈیٹر "الواعظ" کی اس بے بسی پر ضرور ترس آرہا ہے کہ بے چارے جب علمی جوابات دینے سے قاصر ہوگئے تو سستی اور بازاری زبان میں اٹھلا اٹھلا کر دھمکیاں دینے لگے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

بھٹو کا مسئلہ

شان ہند ہوٹل کی ٹوٹی تپائی پر بیٹھے مرزا جمن کے جسم میں چائے کی ایک گھونٹ سے جیسے ہی گرمی پہنچی، فوراً ہی بولے، ہاں بھئی بھٹو کی پھانسی کا معاملہ تو خوب رہا، جب انھیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، تو تپائی کے دوسرے سرے پر اونگھتے ہوئے ایک بڑے میاں کو انھوں نے ٹھیلتے ہوئے کہا، اماں ننھے بھائی کیا سو گئے؟ یار تم بھی عجیب آدمی ہو، یہاں اتھل پتھل ہوئی جا رہی ہے اور تم کو کچھ خبر ہی نہیں، اپنی نیند بھری آنکھوں کو ملتے ہوئے ننھے بھائی بولے، کیا ہوا بھائی خیریت تو ہے؟ مرزا جمن بولے لو بھائی تم کو کچھ خبر ہی نہیں، بھٹو کو پھانسی ہو گئی، بھٹو حامیوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اور جماعت والے چراغاں میں مصروف ہیں، ننھے بھائی نے اوبے ہوئے لہجہ میں کہا، اماں چھوڑو بھٹو ولٹو کا چکر دنیا میں تو یہی لگا رہتا ہے، کسی گھر سے جنازہ اٹھ رہا ہے اور کسی گھر میں بینڈ باجا بج رہا ہے ہم کو کیا لینا دینا ہے.

ننھا دن بھر چوناکاری کا کام کرنے کے بعد شام کو کچھ دیر دل بہلانے اور بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے شان ہند ہوٹل میں آ کر ضرور بیٹھتا ہے، وہ بھی شانِ

ہند ہوٹل کی نیم مردہ نیم زندہ بھٹی کے پاس کھڑا کھڑا مرزا جمن اور ننھے بھائی کی باتیں سن رہا تھا، ننھے بھائی کی بات سن کر اس سے رہا نہ گیا، اور اپنے ہاتھوں پر سے چونا پونچھتے ہوئے بولا "ارے یا کیسے کہت ہو آپ ننھے بھائی، وہ تو اپن پالٹی ہے، اود کا نام ے جماعت ہے اسی لئے اوکی جیت ہمار سب لوگن کی جیت ہے"۔

شان ہند ہوٹل کے لئے یہ موضوع کوئی نیا نہ تھا بلکہ یہاں تو ملکی سیاست سے لیکر عالمی سیاست تک گفتگو ہر وقت ہوا کرتی ہے کبھی امریکی صدارت بحث کا موضوع ہے کبھی عرب اسرائیل جنگ، اور کبھی پاکستان کا الکشن، اور پھر ہر شخص اس آزادی کے ساتھ ان موضوعات پر بے پر کی اڑاتا، کہ بس سنیئے اور سر دھنیئے، یوں مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور نہ اس سلسلہ میں کسی سے گفتگو کرنا کچھ مفید سمجھتا ہوں، بس ہاں یونہی کبھی کبھار کے لئے قسم بھی نہیں ہے، لیکن بہر حال باوجود اپنے محلہ میں ہونے کے اس ہوٹل کی سیاست میں دلچسپی لینا میں نے اپنے لئے ہمیشہ حرام سمجھا، مگر بھٹو کی پھانسی کا مسئلہ تو ایسا درد سر بن گیا ہے کہ جہاں جائیے یہی موضوع گفتگو ہے، کوئی بھٹو کی حمایت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے انہیں امن کا دیوتا، جمہوریت کا پیکر اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر ضیاء الحق کی موت کی پیشین گوئیاں کر رہا ہے، تو کوئی بھٹو کو مہا پاپی، مذہب بیزار اور اقتدار کا بھوکا قرار دیکر ضیاء کی حمایت پر کمربستہ ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ بات زبانی سے گرمی تک پہنچ گئی۔ اور بیچ بچاؤ کرنے والوں کو اپنی خدمات پیش کرنا پڑیں۔ بھٹو کا بھوت اگر ضیاء پر سوار ہوتا تو کچھ سمجھ میں آنے والی بات بھی تھی، مگر یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ہمارے بھارت دیش کی جنتا پر یہ بھوت کیسے سوار ہو گیا۔

اخبار والے بھلا عوامی دلچسپی کے اس اہم موضوع کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اخباروں کو اڈیٹوریل کے لئے دلچسپ موضوع کے علاوہ اخبار بھرنے کے لئے گرما گرم عنوانات بھی مل گئے، اور روزانہ نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں، اپنا اڈیٹر اگرچہ بفضل خداوندی کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہے، مگر ایک ذمہ دار رسالہ کے اڈیٹر ہونے کے ناطے غالباً اس موضوع پر اس سے بھی کچھ لوگوں نے رائے ضرور طلب کی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ آج صبح جب دفتر پہنچا تو بھٹو کا مسئلہ ہی زیر بحث تھا میں نے اپنے دل میں کہا، یا خدا! ۔ دفتر البدر کو بھی زمانے کی ہوا لگ ہی گئی، اب تک اس جگہ کو محفوظ سمجھ کر یہیں آکر پناہ لیتا تھا، اور بھٹو ضیاء کے نعروں سے بوجھل فضا سے جان بچانے کا موقع مل جاتا تھا، مگر وا حسرتا کہ یہاں بھی یہی موضوع! علیک سلیک کے بعد اڈیٹر صاحب میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے یوں لب کشا ہوئے، کہو بھائی تمہاری کیا رائے ہے اس سلسلہ میں کہ بھٹو کو پھانسی برحق ہوئی یا ناحق؟ میں نے کہا میں اپنی حکومت کا وفادار ہوں جو حکومت کی پالیسی وہی میری پالیسی، چونکہ ہمارے وزیر اعظم اس مسئلہ کو پاکستان کا اندرونی معاملہ سمجھ کر اس پر کچھ گفتگو کرنا نہیں چاہتے، پھر بھلا میں کیسے اس سلسلہ میں کوئی رائے قائم کر سکتا ہوں، میں پڑوسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو قطعی ناپسند کرتے ہوئے اس مسئلہ پر کچھ رائے دینے سے قاصر ہوں،

دفتر میں بیٹھے ایک مناسب شکل وصورت اور تراشی خراشی داڑھی والے صاحب (جن سے میں واقف نہیں) بولے، یہ آپ نے کیا بات کہی؟ اب تو یہ ہمارے ملک کا بھی مسئلہ بن گیا ہے، بھٹو کی غائبانہ نماز جنازہ ہو رہی ہے، مغفرت

کے لیئے دعائیں ہو رہی ہیں، جماعت اسلامی کے دفاتر میں آگ لگائی جا رہی ہے
جماعت کے وفاداروں کو طرح طرح سے تنگ کیا جا رہا ہے۔ اخبارات اشتعال
انگیز خبریں شائع کر رہے ہیں ان تمام باتوں کے باوجود بھی آپ اسے پاکستان
کا اندرونی معاملہ ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا، تو پھر ہماری حکومت اس
سلسلہ میں کوئی بیان کیوں نہیں دیتی۔ کیا اس کی نظروں سے یہ تمام باتیں پوشیدہ
ہیں؟ ایڈیٹر صاحب بیچ ہی میں بات کاٹ کر بولے، حکومت بیان دے یا نہ دے
وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتی، یہ اس کی اپنی پالیسی کی بات مگر حکومت
کی طرف سے اس پر کوئی پابندی تو نہیں ہے کہ تم اپنی رائے ظاہر کرو۔ ایڈیٹر صاحب
کے تیور دیکھ کر میں حیرانی میں پڑ گیا۔ ان کو کوئی جواب بھی نہیں دے سکتا تھا، اور
اپنی کوئی رائے بھی نہیں ظاہر کر سکتا تھا، کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں خالی الذہن
ہو کر کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ بھٹو شہید ہیں، ضیاء قاتل ہیں، بھٹو مظلوم
ہیں، ضیاء ظالم ہیں، بھٹو معصوم ہیں ضیاء گنہگار ہیں بھٹو پاکستان کے معمار ہیں ضیاء
پاکستان کو تباہ کرنے والے ہیں۔ ہم نے تو بس تصویر کا یہی رخ دیکھا تھا جس اخبار کو
دیکھئے اس میں یہی ملے گا، ایسی صورت میں بھلا آزادی کے ساتھ کوئی رائے قائم
کرنے کا سوال ہی کیا اٹھتا ہے۔ رائے تو اس وقت قائم ہو جب تصویر کے دونوں
رخ سامنے آئیں اور پھر نظر دیکھ کر پہرے نہ بٹھائے جائیں۔

بہرحال کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اس لیئے میں نے بڑی لاچارگی کے ساتھ
کہا، بھٹو کو سزا تو ملنی چاہیئے تھی مگر .... اس کے آگے میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا
تھا کہ وہی صاحب مجھ پر جھپٹ پڑے، مگر کیا؟ جب سزا ملنی چاہیئے تھی تو مل گئی۔ ایـ

اس میں اگر مگر کیسا؟ اب میں بھی جھنجھلا گیا، میں نے کہا اگر یہ کہ ضابطہ کے مطابق سزا ہونا چاہئیے۔ ضیاء کہتے ہیں کہ یہ سزا پاکستان کے سابق برطانوی قانون کے مطابق ہوئی ہے، جماعت اسلامی والے کہتے ہیں کہ اسلامی قانون کے مطابق ہوئی ہے اور دنیا کے تمام لوگ کہتے ہیں کہ نہ برطانوی قانون کے رو سے یہ سزا صحیح ہوئی اور نہ اسلامی قانون کے رو سے، بلکہ یہ سزا تو ضیاء اور جماعت اسلامی کے مشترکہ مفاد کے تحفظ کے قانون سے ہوئی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ضیاء برطانوی قانون کے نمائندہ بن گئے اور میاں طفیل محمد (امیر جماعت اسلامی پاکستان) اسلامی قانون کے واحد ترجمان بن گئے۔ اس طرح دونوں قانون کی نمائندگی ہوگئی۔

ایڈیٹر صاحب بولے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھٹو کو بے قصور سمجھتے ہو اور تمہارے خیال میں بھٹو کو پھانسی پر لٹکا کر ان پر ظلم کیا گیا، میں نے کہا جی حضرت یہ بات نہیں ہے، آپ کی ایک بات میں کہتا ہوں، دوسری نہیں۔ یعنی میرا یہ خیال تو ہے کہ بھٹو کو پھانسی دے کر ظلم کیا گیا، مگر وہ اس لئے نہیں کہ بھٹو بے گناہ تھے اور ان کو کسی بھی حال میں پھانسی کی سزا مل ہی نہیں سکتی تھی بلکہ میرا اعتنا یہ ہے کہ جس انداز میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا، اور جو قانون اس معاملہ میں برتا گیا وہ بس ضیا صاحب اور طفیل صاحب ہی جانتے ہیں۔ باقی دنیا کا کوئی بھی قانون داں اس کی تشریح نہیں کر پا رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب بولے، مگر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ بھٹو پاکستان کا مسیحا تھا، وہ پاکستانی عوام کا قائد تھا اور جمہوری نظام کا بانی تھا، میں نے کہا بیشک لوگوں کا کہنا صحیح ہے۔ بلکہ میری طرف سے ان خوبیوں کا بھی اضافہ کر لیجئے بھٹو صرف جمہوری نظام ہی نہیں بلکہ ایک جمہوری ملک بنگلہ دیش کے بھی بانی تھے

اور بھٹو صرف پاکستانی عوام کے قائد نہیں بلکہ انکی جان و مال کے مالک بھی تھے اور
وہ انھیں جس طرح جس مقدار میں اور جس موقع پر چاہتے خرچ کر لیتے تھے۔ یہ بھٹو کے
جمہوریت پر کامل یقین ہی کی بات تھی کہ ۱۹۷۱ء کے عام الکشن کے موقع پر باوجود
شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی کے مکمل اکثریت حاصل کر لینے کے بھٹو نے اقلیت
میں ہوتے ہوئے اپنے کو پاکستان کی حکمرانی کے لئے اہل تر قرار دیکر بنگلہ دیش کا
جنم دلوایا، اور خود پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ پھر ۱۹۷۷ء کے عام الکشن میں بھی
انھوں نے جمہوری قدروں کی رعایت کرتے ہوئے متحدہ محاذ کی کامیابی کو ناکامی سے
تبدیل کرایا، اور اپنی پارٹی کی جیت کا اعلان کرایا، یہ الگ بات ہے کہ عوام نے اس
جیت اور ہار کو نہیں تسلیم کیا، مگر جمہوریت کے مخالف ان عوام کو نہ صرف پاکستان
بلکہ دنیا میں رہنے کا نااہل قرار دیتے ہوئے انکے احتجاج کرنے پر بھٹو نے ان کو
فوج کی گولیوں سے بھنوا ڈالا، بھٹو کی اور بہت سی ناقابل فراموش اچھائیاں ہیں۔
مگر ان اچھائیوں اور برائیوں سے کیا ہوتا ہے بقول پاکستان کے فوجی حکمران جنرل
ضیاء الحق کے کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی عظیم ہو قانون سے بالاتر نہیں، مگر ضیاء
صاحب نے یہ بات ادھوری کہی، اسی لئے ہمارے عوام اور خاص کر اخبار نویسوں
کی سمجھ میں یہ نہیں آرہی ہے، پوری بات یوں ہے کہ، کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی
عظیم ہو قانون سے بالاتر نہیں، اور کوئی بھی قانون خواہ وہ کتنا ہی اہم ہو، جنرل
ضیاء اور میاں طفیل سے بالاتر نہیں، اگر اس پورے فلسفے کو لوگ سمجھ لیں تو بھٹو کی
پھانسی پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، اور آئے دن کی یہ بحثیں ختم ہو جائیں گی۔

[illegible] بات بڑھنے کے بعد [illegible] کے درمیان وہ اتنے [illegible] صاحب

انتہائی پرسکون نظر آرہے تھے، بلکہ بار بار انکے لبوں پر تبسم کی لکیریں نظر آجاتی تھیں مگر آخری حصہ کے دوران ان کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوتے ہوتے خطرناکی کی حدود میں داخل ہوگئی اس لئے میں سہم کر چپ ہوگیا کہ نہ جانے آگے کچھ کہنے کا کیا انجام ہو؟ میرے خاموش ہوتے ہی وہ انتہائی بیزاری کے ساتھ الجھے الجھے لہجہ میں بولے، آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ اب تک کچھ سمجھ ہی میں نہ آسکا، کہ بھٹو کے مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے، کبھی آپ بھٹو کی مخالفت کرتے ہیں اور ضیاء کی حمایت اور کبھی بھٹو کی حمایت کرتے ہیں اور ضیاء اور جماعت اسلامی کے سربراہ اعلیٰ میاں طفیل کی مخالفت، یہ کیا چوں چوں کا مربہ ہے؟ آپ یہ واضح کیوں نہیں کرتے کہ آپ کا موقف کیا ہے، اور کون مجرم ہے کون جرم سے بری؟

میں نے جواباً عرض کیا کہ حضور والا، میری بنیادی کمزوری یہ ہے کہ میں نہ بھٹو کو معصوم سمجھتا ہوں، اور نہ ہی ضیاء اور میاں طفیل کو، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، کہ ایک مجرم نے جرم کیا تو اسے سزا دینے کے لئے دوسرے مجرم نے ایک دوسرے جرم کا ارتکاب کیا، اب کسے مجرم کہا جائے اور کسے بے خطا، میں اسی حیرانی میں ہوں اسی لئے اس سلسلہ میں کوئی رائے نہیں قائم کر پا رہا ہوں، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کسی چور نے نقب لگا کر کہیں چوری کی اور جب مال کے مالک نے چور پر مقدمہ دائر کیا تو جج نے اس کی سزا یہ تجویز کی کہ خود چور کے گھر نقب لگا کر اس کے گھر کا سارا مال چرا لایا۔ اور پھر اپنے عدل جہانگیری کا ڈھنڈھورا پیٹ رہا ہے کہ دیکھو ہم نے کیسا سچا انصاف کیا ہے جیسے کو تیسی سزا دیدی۔

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارے ایڈیٹر صاحب اس گفتگو سے کچھ خفا نہیں

ہوئے ، بلکہ ان کے چہرہ پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ رینگ رہی تھی ، مگر وہ صاحب آپے سے
باہر ہوئے جارہے تھے ، آخر کار جب انکے برداشت کی ساری قوتیں جواب دے
گئیں ، تو وہ نہایت ہی غصہ کے ساتھ اٹھے اور اڈیٹر البدر کو مخاطب کرتے ہوئے
کہا ، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے اسٹاف میں ایسے ایسے ناکارہ لوگ بھی موجود ہیں
جنھیں سیاسی مسائل سے کچھ واقفیت ہی نہیں ، افسوس ہے کہ ایک رسالہ سے وابستہ
شخص اس طرح بے پر کی اڑائے اور اڈیٹر خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہے میرے
لئے اب یہ ہذیان ناقابل برداشت ہے ، اب میں نہیں رک سکتا ، اور السلام علیکم
کہتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے ، میں نے ان کے جانے کے بعد اطمینان کی سانس لی ،
کہ اب دفتر البدر میں بھٹو کے مسئلہ پر مجھ سے رائے ظاہر کرنے کے لئے اصرار کرنے
والا کوئی نہیں ہے ، لہذا اس سلسلہ میں نہ مجھے کچھ کہنا ہے ، اور نہ ہی سوچنا ہے ۔

◎

میں کیا ہوں؟

ایڈیٹر البدر کہتے ہیں کہ تم بالکل بوگس ہو، بالکل بکواس ہو، مگر آپ بیتی لکھا کرو، اس لئے کہ قارئین اسے پسند کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر میں سراپا بکواس ہوں تو پھر آپ بیتی لکھنے پر اس قدر اصرار کیوں ہے، مگر ایڈیٹر صاحب سے دوبدو بات کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں؟۔

میرے ہمدرد دوستوں کا کہنا ہے کہ ایڈیٹر صاحب کی یہ بات کاردباری ہے تاکہ مجھے اپنی اہمیت کا احساس نہ ہونے پائے، اور میں ہمیشہ ان کا غلام بے دام بنا رہوں، اہلیہ کا کہنا ہے کہ یہ البدر کے ایڈیٹر کی غریب پروری ہے کہ وہ میرے جیسے ناکارہ آدمی کو کام پر لگائے ہوئے ہیں، اگر دفتر البدر سے میری ملازمت چھوٹ جائے تو میں دو روپیہ روز کے لئے بھی مہنگا ہوں۔

کسی ایک شخص کے بارے میں جب اتنی متضاد رائیں ہوں، تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فیصلہ کس قدر دشوار ہوگا۔ چنانچہ میں بھی کافی دن سے اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ آخر میری واقعی حیثیت ہے کیا، مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہا تھا، بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے بارے میں اپنے ایسے واقف کار لوگوں کی رائیں طلب کروں،

جن کی سماجی، سیاسی یا مذہبی حیثیت سے کوئی اہمیت ہو، اور انکی رائے کو وزنی مانا جاتا ہو، چنانچہ ایسے لوگوں کی اپنے ذہن و دماغ میں فہرست تیار کی تو ۹۰ عدد افراد ایسے جمع ہوئے، اب مسئلہ یہ تھا کہ ان تمام حضرات سے رابطہ کیسے قائم کیا جائے جبکہ ان میں سے بہت سے لوگ دور دور جگہوں کے رہنے والے تھے۔ بلکہ دو ایک تو دوسرے ملکوں کے تھے۔ ملاقات کرکے رائے لینے کا سوال کیا تھا، کیونکہ اس کیلئے وقت اور پیسہ درکار تھا، اور ان دونوں چیزوں کا آمد سے زیادہ میرے پاس صرف ہے لہذا یہ تو ہو نہیں سکتا تھا، بس ایک ہی شکل تھی کہ خط کے ذریعہ رابطہ قائم کیا جائے، چنانچہ خط کیلئے ایک مضمون تیار کرنا شروع کیا، باربار مضمون لکھتا، اور پھر اس میں کوئی کمی یا زیادتی پاکر اسے پھاڑ دیتا، بالآخر تین دن کی جدوجہد کے بعد خط کا مضمون تیار ہوا، جو خط کم، فارم تھا۔ یعنی کہ آپ اسے خط بھی کہہ سکتے ہیں اور فارم بھی۔

پہلے صرف خط بھیج کر جواب طلب کرنے کا خیال تھا، پھر یہ احساس ہوا کہ خط کا جواب دیتے وقت ضروری نہیں کہ لوگ میرے تمام سوالات کے جوابات دیدیں، اس لئے بہتر و مناسب صورت یہی سمجھی کہ جو خط بھیجا جائے اسی کو فارم بنا دیا جائے اور درخواست کی جائے کہ اسی فارم کو پر کرکے بھیجدیجئے، اس طرح تمام سوالات کے جوابات مل جائیں گے، اور میری سمجھ میں ہے کہ فیصلہ ہو جائیگا۔ چنانچہ اس خط نما فارم کیلئے مندرجہ ذیل مضمون کو آخری شکل دیدی۔

عالی جناب! آپ سب کچھ ہیں میں کچھ بھی نہیں ـــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، دمناسب سمجھئے تو قبول کریئے، ورنہ چھوڑ دیجئے کیونکہ دل کی کا کوئی سوال

نہیں ہے)

مزاج گرامی! (اچھے ہوں یا خراب، یہ تو محض رسمی بات ہے ورنہ مجھے کیا؟) آپکی خدمت میں یہ عریضہ (سوالنامہ) اس لیئے ارسال کر رہا ہوں کہ آپ مجھے خوب اچھی طرح واقف ہیں (ناواقف لوگوں کو یہ خط نہیں بھیج رہا ہوں، لہٰذا اگر پوسٹ مین کو چائے پلا کر کوئی صاحب پڑوسی کی ڈاک وصول کرتے ہوں اور ان کے پاس یہ خط پہنچے تو وہ ہرگز جواب نہ دیں۔) ماہنامہ البدر کاکوری میں مسلسل دو سال سے آئینہ کے نام سے طنزیہ خاکے لکھ رہا ہوں۔ (اور اپنے اعمال بد کی سزا بھگت رہا ہوں) لہٰذا آپ مہربانی فرماکر میری ذات سے متعلق مندرجہ ذیل فارم کو پر کر کے لوٹتی ڈاک سے (اگر آتی ہے آپ کو یہ خط مل جائے تو) ارسال فرماکر شکریہ کا موقع عطا کریں۔ (کیونکہ ڈاک ٹکٹ آپ ہی کو لگتا ہے) فقط آپ کا فرمانبردار (ایڈیٹر البدر پر اس کا اظہار نہ کیجیے گا) میاں مردم شناس

اس خط کے بعد اسی کے نیچے فارم کے مندرجہ ذیل کالم تھے۔

(۱) میرا نام آپ کو کیسا لگتا ہے؟

(۲) اگر میں اپنا نام بدل دوں تو پھر کیا رکھوں؟

(۳) ایڈیٹر البدر اچھے ہیں کہ میں؟

(۴) میرے مضامین آپ کو کیسے لگتے ہیں؟

(۵) اگر میں لکھنا چھوڑ دوں تو؟

(۶) میں اپنے منتخب مضامین کا مجموعہ "ہنسی ہنسی میں" کے نام سے چھاپنے جا رہا ہوں، آپ اس میں میری کتنی مدد کریں گے؟

(۷) معاشرہ میں میرا مقام کیا ہے؟

(۸) اگر میں ادارہ البدر کی ملازمت چھوڑ دوں تو مجھے آپ اس سے اچھی جگہ کوئی دوسری دلوا سکتے ہیں؟

اس پورے خط نما فارم کو لے کر نظیر آباد پہنچا اور سائیکلو اسٹائل کے ذریعہ اس کی سو کاپیاں تیار کرائیں، اور پہلے سے تیار شدہ لسٹ کے مطابق تمام پتوں پر ایک ایک کاپی روانہ کر دی، صرفہ ڈاک مبلغ بائیس روپے پچاس پیسے ہوا (اسوقت لفافہ کی قیمت حکومت کی نادانی سے ۲۵ پیسے تھی اگر اسی وقت عقل آ چکی ہوتی اور قیمت ۳۰ پیسے ہوتی تو مزید چار روپے پچاس پیسے کا بار پڑتا) خطوط لیٹر بکس کے حوالہ کر کے جواب کا انتظار کرنے لگا، خیال تھا کہ ہفتہ بھر بعد سے جواب آنے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا مگر ایک ہفتہ کے بعد دوسرا ہفتہ بھی گذر گیا، اب میں نے پوسٹ مین کو ٹوکنا شروع کیا، وہ ہر بار یہی کہتا کہ بھیا اگر آپ کا کوئی خط ہوتا تو میں خود پہنچا دیتا، آپ اطمینان رکھیئے، خط آتے ہی اسی دن لیکر گھر آؤں گا، ایک ہفتہ اور اسی عالم میں گزر گیا۔ اب مجھے خطوط روانہ کیے ۲ ہفتے ہو چکے تھے، میرا یہ گمان یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ دونوں میں سے کسی طرف کے پوسٹ مین کی حرکت سے مجھے جواب نہیں مل پا رہا ہے، یا تو میرے خطوط ضائع کر دیے گئے (جس کا امکان کم تھا کیونکہ مختلف شہروں کے پتوں پر روانہ کیے گئے تھے) یا پھر میرے نام آئے ہوئے جوابات میرا پوسٹ مین ضائع کر رہا ہے (اس کی امید زیادہ تھی کیونکہ اکثر اخبارات میں پڑھا تھا کہ بہت سے پوسٹ مین پیالی دو پیالی چائے بنانے کے لئے کوئلہ اور لکڑی سے زیادہ بہتر ایندھن خطوط کو سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں) چنانچہ ایک

دن میں نے اپنے پوسٹ مین کو روک ہی لیا، اور اس سے کہا کہ آج میں جانے نہ دوں گا، ورنہ بتاؤ کہ میرے خطوط کہاں ہیں؟ شروع میں اس نے نرمی اور خوشامد کے ذریعہ کام چلانے کی کوشش کی، مگر بات نہ بنتی دیکھ کر گرمی اختیار کر لی میں تو پہلے ہی سے ادھار کھائے بیٹھا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شور و ہنگامہ ہوا، کہ آس پاس کے لوگوں کو بیچ بچاؤ کرنا پڑا۔ اس دن کے واقعہ کا مجھ پر یہ ردِ عمل ہوا کہ پھر میں نے پوسٹ مین سے خطوں کے بارے میں دریافت کرنا چھوڑ دیا۔ البتہ روزانہ کا یہ معمول بنا لیا کہ جس وقت پوسٹ مین آتا، میں سڑک پر نکل کر کھڑا ہو جاتا، اور وہ مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ جاتا، جہاں تک وہ مجھے نظر آتا میں نظروں سے اس کا تعاقب کرتا رہتا۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو میں بھی بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آتا۔

ایک ہفتہ اور اسی بے چینی میں گزر گیا، آخر کار پانچویں ہفتہ میں نے یہ طے کیا کہ براہ راست ڈاکخانے سے رابطہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ جیب میں تین چار روپے ڈال کر ڈاکخانہ کی طرف چل دیا، (کیونکہ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہی ہو گا کہ آج کل بغیر چائے پانی کے بابو لوگ بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں)، اور ڈاکخانہ کا بھی دوسرا نام پوسٹ آفس ہے، شکر ہے خدا کا کہ بابو جی بہت خندہ پیشانی سے ملے اور چائے پانی کی پیش کش کو بھی انھوں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میری چائے پینے کی عادت نہیں ہے دادر دائے کی میرے پاس گنجائش نہ تھی، بابو جی نے گفتگو کے درمیان بڑی تفصیل کے ساتھ ڈاکخانہ کی کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دیکھئے یہ رجسٹرڈ پارسل غائب ہو جانے کی شکایات ہیں، میں نے ان پر اب تک اتنا کام کیا ہے مگر کوئی

جواب نہیں مل پا رہا ہے تقسیم کرنے والے ڈاکخانہ تک وی۔ پی پہنچ چکی ہے اور اس کا ریکارڈ موجود ہے، مگر اس ڈاکخانہ کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے کہ وی۔ پی تقسیم کی گئی یا نہیں۔ اور اگر تقسیم کر دی گئی تو رقم کیا ہوئی؟ اور دیکھئے میرے ڈاکخانہ سے ڈیڑھ مہینے سے وی۔ پی رسید بک غائب ہے بار بار ہیڈ آفس کو لکھ کر بھیج رہا ہوں، مگر وہاں سے کوئی کارروائی نہیں ہو رہی ہے وی۔ پی روانہ کرنے کے خواہش مند لوگ میری جان کھائے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ ان حالات میں اگر آپ کو سادہ ڈاک سے روانہ کیا ہوا خط نہیں مل رہا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ انتظار کیجئے ممکن ہے کہ مہینہ دو مہینہ میں آ ہی جائے۔

بابو جی کی بات چیت سے میں اتنا مطمئن ہوا کہ اپنے پوسٹ مین کی طرف سے دل میں جو کدورت تھی وہ بھی دور ہو گئی اور میں نے اس سے صلح کر لی۔

دو ہفتہ مزید گزرنے کے بعد ایک دن پوسٹ مین نے دروازہ کی کنڈی زور زور سے پیٹنا شروع کی، ساتھ ہی وہ آوازیں دے رہا تھا کہ خط لے لیجئے میں بھاگا دوڑا دروازہ پر آیا تو پوسٹ مین نے چائے کی فرمائش کے بعد دو عمر رفتہ اور بوسیدہ قسم کے لفافے میرے حوالے کئے۔ اور ۲۰ ر پیسے کے بیرنگ کی خوش خبری سناتے ہوئے اس کی مانگ کی۔ میں نے چونک کر کہا۔ مگر لفافے تو ڈاکخانہ کے ہیں۔ اس نے کہا، کہ ہاں مگر یہ ۲۵ ر پیسے والے لفافے ہیں اور اب لفافہ ۳۰ ر پیسے کا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا یہ کب کے چلے ہوئے ہیں؟ اس نے لفافے ہاتھ سے لئے اور گھما پھرا کر سب سے پہلے والی مہر کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کی دونوں

لفافوں میں سے ایک پر کل سات اور دوسرے پر کل ۸ مہریں ڈاکخانوں کی لگی ہوئی تھیں) اور پھر اس نے اطلاع دی کہ ان میں سے ایک ۵/۵/۹/۷۶ کا اور دوسرا ۲ر۵/۹/۷۶ کا چلا ہوا ہے۔ میں نے کہا یہ تو ڈاکخانہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ وقت پر یہ خطوط پہنچاتا، کیونکہ بڑھی شرح ڈاک یکم جون سے نافذ ہوئی ہے ایک تو اتنی تاخیر سے خط پہنچا کر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا، اور پھر اس پر سے الٹا ہم سے تاوان کا مطالبہ ہو رہا ہے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مگر میری اتنی قوی دلیل کو اس نے یہ کہہ کر توڑ دیا کہ ڈاکخانہ کا قانون یہی ہے۔ آخر تھک ہار کر ۲۰ر پیسے ڈاکخانہ کیلئے اور ۲۵ر پیسے چائے پینے کے لئے دیکر اسے رخصت کیا۔

اور پھر پہلا لفافہ کھولا، یہ ہندوستان کے مشہور اور مایۂ ناز پیر صوفی چراغ علی قلندر کا خط تھا۔ خط تو بڑا تفصیلی تھا، جس کا آغاز "حماقت مآب سلکم اللہ" کے خطاب سے تھا، اور اس میں لمبی چوڑی نصیحتوں کے دفتر کھولے گئے تھے مگر میرے سوالات کے جوابات نہایت ہی مختصر اور جامع تھے، خط کا مضمون قارئین کو بتانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر باتیں راز میں رہنے والی ہیں، البتہ سوالات کے جوابات نقل کر رہا ہوں، جو حسب ذیل ہیں (صرف جوابات نقل کر رہا ہوں، ان کو سوالات سے ملا لیجئے۔)

(۱) حقیقت سے بہت دور،

(۲) گدھا یا گدھے کی دم۔

(۳) دونوں میں سے کوئی نہیں، کیونکہ ایڈیٹر البدر کٹر وہابی ہے اور تم ان کے نمک خوار غلام۔

(۴) بالکل واہیات، مگر ہر ماہ صرف اسے ہی پڑھنے کیلئے رسالہ البدر کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہوتا ہوں۔

(۵) قوم پر بہت بڑا احسان ہوگا، اور اڈیٹر البدر کی کھٹیا کھڑی ہو جائے گی۔

(۶) تعاون علی الاثم گناہ کبیرہ ہے، لہٰذا کچھ بھی نہیں، بلکہ حتی المقدور کاٹ ڈالوں گا۔

(۷) کاش کہ کچھ بھی نہ ہوتا۔

(۸) اگر عقائد کی اصلاح کرلو، تو ڈیوڑھی تنخواہ پر خانقاہ کا چوکیدار رکھ لوں گا۔

جوابات پڑھ کر دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو کبھی غلط فہمی کا شکار ہوکر اصل حقیقت سے بھی آگاہ ہونے کا اتفاق ہوا ہو۔ جھنجھلا کر خط ایک طرف پھینک دیا۔

دوسرا لفافہ کھولا، یہ خط ایک محترمہ کا تھا جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اگر اڈیٹر صاحب کو پتہ چل گیا، تو ایسی مزاج پرسی ہوگی، کہ ساتوں طبق روشن ہو جائیں گے۔

خط کا مضمون صرف اس قدر تھا، "محترمی۔ سلام مسنون، آپ کے سوالات کے جوابات حاضر ہیں، سوالنامہ آپ کے پاس ہوگا، اسی سے ملا لیجئے گا، فقط.....

(۱) نامکمل۔

(۲) پورا نام یعنی کہ حقیقت شناس۔

(۳) موازنہ میرے لئے مناسب نہیں ہے۔

(۴) کبھی قہقہے لگاتی ہوں، کبھی آنسو بہاتی ہوں۔

(۵) قدرت کی بخشی ہوئی کسی صلاحیت سے فائدہ اٹھاکر دوسروں کو فائدہ نہ پہنچانا کفرانِ نعمت ہے۔

(۶) ۵۰۰ سو کاپیاں خرید کر مفت تقسیم کرادوں گی۔

(۷) البدر کی ڈاک دیکھ لیجیے، پتہ چل جائے گا۔

(۸) کسی حادثہ کے بارے میں پہلے سے منصوبہ نہیں بنایا جاتا۔

ان جوابات کا سوالات سے موازنہ کرکے کئی مرتبہ پڑھا۔ اور پھر خط تہہ کرکے لفافہ میں رکھ دیا۔

دو ہفتہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، پھر کوئی تیسرا خط نہیں آیا۔ اور میرا سوال ابھی اپنی جگہ پر قائم ہے کہ "میں کیا ہوں؟"۔

آخر قارئین البدر کو آئینہ دکھانے کا وقت آگیا، دماغ میں چونکہ یہی سوال گونج رہا ہے کہ "میں کیا ہوں؟"، اس لئے اس کا جواب حاصل کرنے کی سب سے بہتر تدبیر یہی سمجھ میں آئی کہ قارئین البدر سے دریافت کرلوں کہ "میں کیا ہوں؟"۔

تو اے معزز قارئین!۔ آپ کے سامنے سوالنامہ بھی حاضر ہے، اور میرا اعمالنامہ بھی۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں کہ بتائیں کہ "میں کیا ہوں؟"۔

خدا کرے آپ کا خط ڈاک میں ضائع بھی نہ ہو، بیرنگ بھی نہ ہو، اور صرف دو ہفتے میں مجھے مل بھی جائے۔

خیالوں کی دنیا

کہتے ہیں کہ گھوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں مگر اس کیلئے عام شہرت کے مطابق بارہ برس کی مدت درکار ہوتی ہے اور آدمی کے بھی دن پھرتے ہیں، مگر اس کے لئے کوئی مدت نہیں بیان کی جاتی ہے کبھی کبھی یہ دن تو اتنی جلدی پھرتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں خدا بھلا کرے سعودی عرب کا جب سے اس نے ہندوستانیوں کو کام دینا شروع کیا ہے تو ایسی دسیوں مثالوں سامنے آچکی ہیں کہ سالوں میں نہیں مہینوں میں دن پھر گئے۔ اور جھونپڑوں میں رہنے والے محلوں کی بات کرنے لگے کرائے کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کی جگہ عالیشان پختہ ذاتی مکانات تعمیر ہو گئے اور ایک دم کی بدولت گھر کے تمام افراد کے بدن پر فارن کا لباس فارن کی گھڑی، اور فارن کا ساز و سامان نظر آنے لگے، غرض کہ زندگی کا یا پلٹ ہو گئی اور سی، کلاس دکلاس کے کتنے ہی لوگ اے کلاس میں داخل ہو گئے

میں بھی تو اسی دنیا کا رہنے سہنے والا ہندوستان ہی کا باشندہ ہوں پھر بھلا میرا دل بھی ان ترقی یافتہ مناظر سے کیسے نہ متاثر ہوتا چنانچہ کئی مرتبہ خیال

آیا کہ چلو کسی طرح دو چار پانچ ہزار روپیہ اکٹھا کر کے کسی "معتبر ایجنٹ" کے ذریعہ سعودی عرب چلا جائے، اور پھر وہاں پہنچ کر تو "ریال کا درخت" ہاتھ آ ہی جائے گا۔ زیادہ نہیں سال دو سال میں اتنا مال اکٹھا ہو جائیگا کہ بقیہ زندگی چین و عیش کی گزرے گی، اگر کچھ دن سعودی عرب کی سڑکوں پر جھاڑو دینے کے فرائض بھی انجام دینے پڑے تو کیا ہوگا، کون ہوگا وہاں دیکھنے والا؟ یہاں تو سب کو یہی اطلاع ہوگی کہ تین ہزار روپے مہینہ پر ملازم ہیں، روز روز کی ہائے ہائے کھٹ کھٹ سے تو نجات ملے گی، ایڈیٹر البدر کی ڈانٹ اور گھڑکیوں سے تو چھٹی مل جائے گی، مگر ہائے ہمارے قسمت کہ اس نے کبھی ہمارا ساتھ نہ دیا،

ایک مرتبہ شہر لکھنؤ کی ایک بہت ہی مشہور اور معتبر کمپنی (جو خیر سے اب مرحوم ہو چکی ہے اور حکومت کا اس خدمت گار ادارے پر یہ الزام ہے کہ اس نے پبلک کا لاکھوں روپیہ سبز باغ دکھا کر لوٹ لیا، اور اسی الزام میں کمپنی کے اعلا ذمہ داران ان دنوں سرکاری مہمان ہیں یعنی کہ جیل میں بند ہیں) کا فارم وغیرہ بھی لے آیا اور خیال تھا کہ مقررہ فیس ادا کر کے اپنا رجسٹریشن کرالوں گا، مگر ہمارے منصوبے کی خبر کسی طرح ایڈیٹر البدر کو ہو گئی، اور انھوں نے اپنی عدالت میں طلب کر کے پہلے تو سوالات کی بوچھار کی، اس کے بعد اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا، کہ دیکھو تمہارے جیسے لوگوں کے لئے سعودی عرب میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے خول کے اندر رہو، اس سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ کوئی ہنر تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تعلیم بھی بس واجبی ہی سا ہے رہ گیا سوئپر وغیرہ جیسے کاموں کا معاملہ تو وہ تمہارے بس کے نہیں ہیں، اس لئے اپنا پیسہ اور وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آئندہ تم

اس کوشش سے باز آجاؤ ورنہ میں مجبوراً تم کو تمہاری اصل حقیقت بتانے کی خاطر
ادارہ البدر سے بھی الگ کر دوں گا لیکن ایڈیٹر صاحب کی اس دھمکی کے باوجود
میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اہلیہ کو اس سلسلہ میں اپنا رازدار بنا کر ان
کو بتایا کہ بس عرب جانے کی دیر ہے گھر میں مایا کی بارش ہونے لگی اور ہر طرف ہن
برسے گا مگر شرط یہ ہے کہ میرے اس پروگرام کی خبر جب تک میں نہ کہوں ایڈیٹر البدر
کو نہیں ہونا چاہیئے۔ اہلیہ باوجود ایڈیٹر البدر کی انتہائی معتقد ہونے کے اپنی قومی
کمزوری پیسے کی خاطر اس معاملہ میں ایڈیٹر البدر سے بغاوت پر آمادہ ہو گئیں اور
کمپنی میں میرا رجسٹریشن خود بخود ختم ہو گیا مگر ناگہانی طور پر کمپنی خود ہی شکنجہ میں آگئی اور
میرا رجسٹریشن خود بخود ختم ہو گیا میں نے اور اہلیہ نے مل کر اس ادھورے خواب کے
پریشان ہونے پر شیخ چلی کی سنت ادا کرتے ہوئے کافی مرثیہ خوانی کی اور پھر عرب
جانے کا خواب ہمیشہ ہمیش کے لئے دفن ہو گیا اور میرے دن پھرتے پھرتے رہ گئے

سیاسی دنیا میں دن پھرتے کتنی دیر لگتی ہے روزمرہ ہم لوگ اس کو دیکھتے
ہی رہتے ہیں کل تک جن کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہ تھا آج انہی کے اردگرد خوش
آمدیوں کی ایک بھیڑ ہے اور نیتا جی نیتا جی، کہتے کہتے لوگوں کی زبانیں خشک ہو رہی
کیونکہ خیر سے کل کے کچھ بھی نہیں آج کے بہت کچھ یعنی کہ منسٹر ہو چکے ہیں

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ جن دن پھرے ہوتے
ہیں وہ جس کے بادمیں خود دن پھیر دیں، آدمیوں کی حد تک تو خیر آپ کی سمجھ میں یہ
بات آجائے گی لیکن جب بات اس سے آگے بڑھے تو یقیناً حیرانی ہوگی مگر اب حیران
ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ ابھی کچھ ہی دن پہلے ہمارے

ملک کے سابق وزیراعظم شری مرارجی دیسائی پیشاب کے دن پھر چکے ہیں، اور نالی میں بہنے والی چیز کو ترقی دے کر منہ تک پہنچا چکے ہیں۔ دیکھئے یہ سب اپنے دن پھرے ہونے کی باتیں ہوتی ہیں، مثل مشہور ہے کہ جس کے منہ میں چاول ہوتے ہیں وہی چباتا ہے، اسی طرح ہمارے سابق وزیراعظم صاحب کا معاملہ تھا کہ وہ پیشاب نوشی کے خود اپنے ہی بیان کے مطابق برسوں سے عادی تھے اور اس حیات بخش وٹامن کو بقدر ۶ اونس روزانہ نہار منہ استعمال کرتے تھے، مگر جب تک وہ خود ہی کچھ نہ تھے کسی اور کو کیسے کچھ بناتے، اور جب وہ وزیراعظم بن کر "بہت کچھ" ہو گئے تو پیشاب کو بھی ترقی مل گئی تھی حتیٰ کہ پھر جب ان کے دن بگڑے، اور وہ راج گدی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو لکھنے والوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ "پیشابی سرکار ختم"۔

تو بات یہ چل رہی تھی کہ دن پھرتے دیر نہیں لگتی، اور یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کے دن کب پھر جائیں۔ یہ ساری تمہید محض اس لئے ہوئی کہ میں آپ کو یہ خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ اب میرے بھی دن پھرنے کی ہلکی سی امید ہو گئی ہے۔ پھر کہیں آپ یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ چیونٹی کے پر نکلنے لگے ہیں۔

میرے اس کہنے سے آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، کہ سعودی عرب سے کوئی ویزا وغیرہ آ گیا ہے، بلکہ بات دراصل یوں ہے کہ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے کہ ایک دن میں دفتر البدر پہونچا، تو ایڈیٹر صاحب بہت ہشاش بشاش نظر آئے، اور ملازمت کے دوران پہلی مرتبہ انھوں نے مجھے بہت چاؤ کے ساتھ اپنے قریب بلا کر بٹھایا، اور میرے مضامین کی تعریفیں کرنے لگے، وہ کہہ رہے تھے کہ تمہارے مضامین حلقہ البدر میں بہت مقبول ہو رہے ہیں، واقعی تم بڑی محنت سے البدر

کے لئے لکھتے ہو، اور تم نے البدر کی نیک نامی میں بہت موثر رول ادا کیا ہے۔ وہ
یہ سب کچھ کہہ رہے تھے اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آج ہمارے ایڈیٹر
صاحب کو کیا ہو گیا ہے کیا سورج مغرب سے آج طلوع ہوا ہے؟ پھر اچانک
اس تصور سے کانپ اٹھا کہ کہیں یہ تعریف کسی آنے والے خطرے کا پیش خیمہ
تو نہیں ہے؟۔

ابھی اندیشے اور مسرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہی تھا کہ ایڈیٹر صاحب
نے ایک خط میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، دیکھو یہ میرے بہت ہی خاص آدمی
کا خط ہے جو میری ذات کے ساتھ ساتھ البدر سے بھی بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں، ان
کا کہنا ہے کہ میاں مردم شناس کے منتخب مضامین کا عربی ترجمہ کرایا جائے اور
پھر اسے کتابی صورت میں شائع کر کے عرب ممالک پہونچایا جائے، کیونکہ ان میں دینی
امور کی وضاحت کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کی بہت اچھے انداز میں عکاسی
ہوتی ہے۔۔ میں نے خط کی ابھی ابتدائی چند سطریں ہی پڑھی تھیں کہ ایڈیٹر صاحب
نے کہا کہ خط بعد میں تفصیل سے پڑھ لینا۔ اس کو تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ، اور پھر
اس پر غور کر کے بتانا کہ تمہارے کن کن مضامین کا عربی ترجمہ اس انتخاب میں شامل
کیا جائے، تم جلد ہی مضامین منتخب کر کے بتا دو، تاکہ ترجمہ کا کام شروع کیا جائے
اور پھر مکتوب نگار کی خواہش کے مطابق اس کو جلدی شائع بھی کر دیا جائے،
کیونکہ اشاعت کے سلسلے میں کافی حد تک انھوں نے مالی تعاون کا بھی وعدہ کیا ہے

خط لے کر میں گھر واپس آگیا، اور مضامین کے انتخاب کے بجائے اپنے روشن مستقبل
کے تانے بانے بنانے میں مصروف ہو گیا، تصورات کی دنیا میں مجھے اپنے مضامین

کے عربی ترجمہ کا یہ مجموعہ نہایت ہی خوبصورت کتابی شکل میں نظر آیا، پھر میں نے دیکھا کہ یہ مجموعہ عالم عرب میں پہونچ چکا ہے اور اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے ہزاروں کی تعداد میں نسخے پہونچ چکے ہیں اور ابھی مانگ برابر جاری ہے جو لوگ اس کتاب کا مطالعہ کر چکے ہیں ان کے دلوں میں میاں مردم شناس کی دھاک بیٹھ چکی ہے اور وہ اسے صرف ایک ملاقات کی خواہش مند ہیں ۔ میرے نام عرب ممالک کی مختلف تنظیموں کی طرف سے دعوت نامے آئے ہیں اور میں باری باری تمام ممالک کی سیر کا پروگرام ترتیب دے رہا ہوں یہ اور اسی جیسے بہت سے خیالات...... اچانک میں اس عالم واپس آیا! میں نے سوچا کہ میں بھی کہاں پہونچ گیا اور پھر اپنی فکر کی پرواز پر خود ہی ہنسی آگئی مگر اتنا تو بہوش و ہواس عین عالم بیداری میں فیصلہ کر لیا کہ یقیناً یہ چیز میری ذات کے بڑے بڑے فوائد کے حامل ہے لہذا مجھے مضامین کے انتخاب میں دیر نہ کرنی چاہیے چنانچہ یہ سوچ کر اٹھا ہی تھا کہ البم کی فائل اٹھا کر ان میں سے مضامین کا انتخاب کیا جائے کہ اہلیہ سے نظریں چار ہوگئیں اہلیہ نہ معلوم کتنی دیر سے میری نقل و حرکت کا معائنہ کر رہی تھیں مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی انھوں نے سوال کیا خیریت تو ہے آج اس قدر خوش کیوں نظر آر ہے ہیں کیا لاٹری نکل آئی ہے میں نے کہا لاحول ولا قوۃ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس دن سے صوفی بیقرار نے لاٹری کی حرمت کا فتویٰ اور کیا ہے میں نے لاٹری کا ٹکٹ خریدنا قطعی بند کر دیا ہے اب اس فعل کا حرام میرے سامنے ذکر بھی مت کرو۔ اہلیہ نے کہا مگر صوفی بیقرار نے خود تو ٹکٹ خریدنا نہیں بند کیا ہے کل ہی ان کی بیوی آئی تھیں وہ بتا رہی تھیں کہ اس مرتبہ

صوفی صاحب کو پچاس روپے لاٹری میں ملے ہیں، میں نے اہلیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

چھوڑو! اللہ والوں کی کوئی بات بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتی، صوفی صاحب کے ٹکٹ خریدنے میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی، جہاں تک ہماری نظر نہیں جا پاتی، ہم کو تو ان کے فتویٰ سے سروکار ہے، چنانچہ جب سے انھوں نے فتویٰ دیا ہے اس وقت سے میں نے ٹکٹ خریدنا بند کر دیا ہے۔

اور پھر میں نے اہلیہ کو مسرت کی اصل وجہ بتاتے ہوئے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کیا اور ان سے نہایت ہی فخر کے ساتھ کہا کہ بس اب وہ وقت قریب ہے جب تم ایک بین الاقوامی شخصیت کی شریک حیات کی حیثیت سے جانی جاؤ گی۔ اب ادارہ البدر کے تین سو روپے ماہوار خشک کے ایک ملازم کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گذارنے کا دور ختم کے قریب ہے اور تمہارا روشن مستقبل تم سے بالکل قریب آچکا ہے۔

اہلیہ نے میری اس گفتگو کے جواب میں ایک نہایت ہی فرمائشی قسم کا زوردار قہقہہ لگایا۔ جس سے میری تیوریوں پر بل پڑ گئے، اہلیہ کی اس بے وقت کی راگنی پر غصہ تو بہت زور کا آیا۔ مگر ضبط کرتے ہوئے میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ اس میں اس طرح ہنسنے اور مذاق اڑانے کی کیا بات ہے؟ کیا تم کو میری رائے سے کچھ اختلاف ہے؟

میرے سوال کے جواب میں اہلیہ نے ایک شعر پڑھ دیا ؎

ہر پھول کی قسمت میں کہاں نازِ عروساں　　کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کیلئے بھی

میں نے کہا کیا مطلب ہے؟ اہلیہ نے جواباً کہا! مطلب یہ ہے کہ کامیابی کا دار و مدار خلوص کے اوپر ہوتا ہے جذبہ خدمت کا ہو تو کامیابی قدم چومتی ہے اور آپ کا جذبہ اول دن سے ہی ناموری اور ریاکاری ہے پھر بھلا کامیابی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا مگر ایسے بھی تو لوگ ہیں جنھوں نے صرف ناموری کے جذبہ سے ہی کام شروع کیا دین کی من مانی تعبیرات پیش بڑی سی بڑی قد آور شخصیت پر کیچڑ اچھالی اپنی شخصیت کو اجاگر کیا دوسروں کو تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا۔ لیکن وہ مقصد میں کامیاب ہو گئے اور ان کی شخصیت کو تسلیم کر لیا گیا؟ اہلیہ نے کہا میں آپ کی مراد سمجھ گئی مگر اس کے لئے بھی سخت ترین جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ آپ کے پاس نہ تنظیم ہے نہ جماعت، نہ اخبار ہیں نہ افراد

اہلیہ نے ہمیشہ کی طرح کٹر وہابی ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے اس مرتبہ بھی میرا راستہ کاٹ کر مجھے احساس کمتری میں گرفتار کر دیا۔ ایڈیٹر البدر کا تقاضا جب شدید ہوتا ہے تو ایک آدھ مضمون منتخب کر کے اوپر دل سے دیتا ہوں اور نہایت کمزور قسم کی امید باندھتا ہوں کہ شاید........ مگر پھر اہلیہ کی بات یاد آجاتی ہے کہ آپ کے پاس نہ تنظیم ہے نہ جماعت نہ اخبار ہیں نہ افراد۔ ان حالات میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرے بھی دن پھریں گے یا نہیں مگر ہاں امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا بھی تو کفر ہے:.:.

گیدڑ بھبکی

میر صاحب چچا میاں کہنے پر بہت زوردار احتجاج کرتے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ جوان ہیں اور جوان لگتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنے پوپلے منہ میں بتیسی لگوا کر انھوں نے اپنے خیال کے مطابق ان لوگوں کی بھی منہ بھرائی کر دی جو ان کو یہ کہہ کر بوڑھا کہتے تھے کہ آپ کے نہ منہ میں دانت ہیں اور نہ پیٹ میں آنت — پیٹ کی آنت کا تو وہ کوئی ثبوت فراہم کر نہیں سکتے تھے۔ البتہ منہ میں مصنوعی دانت لگوا کر انھوں نے یہ انتظام ضرور کر لیا کہ اب انھیں دیکھ کر کوئی پوپلا نہ کہہ سکے، مگر بھلا ہو دانت بنانے والے کا کہ اس نے دانت ایسے بنا کر دیے کہ عین اس وقت جب وہ اپنی جوانی کا اظہار بڑے فخر کے ساتھ کر رہے ہوتے ہیں، پوری کی پوری مصنوعی بتیسی باہر نکل پڑتی ہے اور پھر میر صاحب واقعی انتہائی جذباتی انداز میں دانت بنانے والے کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

بات دراصل یوں ہے کہ دو سال قبل میر صاحب کی رفیقۂ حیات اپنی عمر طبعی پوری کر کے تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ ان کی وفات ہوتے ہی میر صاحب کو اچانک یہ احساس ہوا کہ وہ ابھی جوان ہیں اور جوانی کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسری

شادی ہونا چاہئے، لیکن میر صاحب نے اپنے اس ارادے کا جن جن لوگوں سے اظہار کیا۔ انھوں نے ان کی یہ کہہ کر حوصلہ شکنی کی کہ اب آپ کی عمر اس قابل نہیں ہے کہ آپ نئی نویلی دلہن بیاہ کر اپنی شادی خانہ آبادی کا ثواب اور دوسرے کی خانہ بربادی کا گناہ مول لیں، شروع شروع میں تو میر صاحب سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں بوڑھا نہیں جوان ہوں۔ یہ چچا میاں نہیں بھائی صاحب ہوں، مگر لوگ بھی کہاں ماننے والے تھے۔ جتنا جتنا میر صاحب کا اصرار بڑھتا گیا۔ اتنا اتنا لوگ ان سے دل چسپی لیتے رہے، بالآخر اب یہ نوبت آچکی ہے کہ دور سے دیکھ کر کوئی بھی ان کو چچا میاں کہہ کر پکارے، بس قیامت آگئی۔ وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوتا ہے کہ سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے آخر لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے معاملہ رفع دفع ہوتا ہے کہ چلتے چلتے کوئی منچلا کہہ دیتا ہے "اچھا ہوگا اب آپ بھی چچا میاں غم کھائیے اور بات ختم کیجئے۔" میر صاحب پھر پلٹ پڑتے ہیں، کچھ دیر کے لئے پھر تنا تنی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو آخر ہا ہو پر ختم ہوتی ہے۔

میر صاحب میری سعادتمندی پر پوری طرح یقین رکھتے ہیں کیونکہ اہلیہ کے والد نامدار یعنی اپنے خسر بزرگوار کے دوست ہونے کے ناطے شروع میں میں ان کو چچا میاں ہی کہتا تھا، اور وہ اسی پر خوش ہوتے تھے، پھر جب میر صاحب کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا اور میں نے ان میں جوانی کے جراثیم عود کرتے دیکھے تو میں نے مصلحتاً ان کو صرف میر صاحب کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا، اور پھر جب انھوں نے اپنے عقد ثانی کے ارادہ کا اعلان کیا تو میں نے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے

ہوئے "صاحب" کے ذریعہ بڑھے ہوئے بیلنس کا حساب برابر کرنے کے لئے "اماں میر صاحب" کہنا شروع کر دیا، اور اب جبکہ میں انھیں دیکھتے ہی بڑی اپنائیت کے ساتھ یارانہ انداز میں "اماں میر صاحب" کہہ کر مخاطب کرتا ہوں، تو بے ساختہ وہ اپنی مصنوعی بتیسی کی نمائش کر دیتے ہیں۔

میر صاحب کی میرے بارے میں یہ فلسفیانہ رائے ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لئے میرے اندر بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات پر بھی وہ مجھ سے برابر تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں۔ مگر اب کی مرتبہ باوجودیکہ الکشن کا اعلان ہو چکا ہے اور منڈی کے مزدور سے لے کر آفس کے حاکم تک سب پر سیاسی نشہ چڑھنا شروع ہو گیا ہے میر صاحب خاموش خاموش سے رہے اور پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں پیدا ہوا، آخر ایک دن میں نے ان کو کریدا، کہ اماں میر صاحب کیا قصہ ہے کہ ابھی تک آپنے سرگرم سیاست میں حصہ نہیں لیا، آخر کس کو ووٹ دینے دلوانے کا ارادہ ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں میر صاحب نے ایک سرد آہ کھینچی، اور پھر یوں لب کشا ہوئے، "کیا بتاؤں ڈیر! دل تو چاہتا ہے کہ پرانی جنتا پارٹی کا ساتھ دوں، اور اسی کا ورک کروں۔ کیونکہ اصلی جنتا پارٹی وہی ہے، مگر اس مرتبہ کچھ ایسی پالیسی بن گئی ہے جس نے سارا بیڑا غرق کر دیا ہے، میں نے چونک کر پوچھا، خیریت تو ہے کیسی پالیسی بن گئی ہے؟ بولے یار بات یہ ہے کہ قوم میں طے پایا ہے کہ اس مرتبہ الکشن کا بائیکاٹ کیا جائے، تاکہ سیاسی پارٹیوں پر دباؤ پڑے اور وہ ہمارے نصف فی صدی ووٹوں کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے ہمارے علمہائے مبارک کے مسئلہ کو حل کریں۔ ورنہ پورے نصف

فی صد ووٹوں سے محروم ہوں۔

میں نے کہا میر صاحب! آپ کی قوم کا فیصلہ اپنی جگہ پر بالکل درست اور مناسب اور بروقت ہے۔ مگر ذرا یہ بھی تو سوچئے کہ ساڑھے ننانوے فی صد ووٹ پڑے ہوں تو نصف فی صد کی بھلا کیا پوزیشن ہے۔ جو کوئی سیاسی پارٹی آپ کا دباؤ قبول کریگی

میری اس بات کے جواب میں کچھ دیر تو میر صاحب خاموش بیٹھے ... سوچتے رہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ اسے تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ کھیل ہم سیاسی لوگوں کے سمجھنے کے ہیں، دیکھنا کیسا اثر ہوتا ہے۔

اہلیہ کو میرے ہر شریف دوست کی طرح میر صاحب سے بھی بغض للّٰہی ہے، مثلاً ان کو میرے دوست مرزا یقین سے اس لئے نفرت ہے کہ ان کے پاس سوائے کبوتر بازی کے دوسرا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ گھر میں جوان جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں جن کی شادی بیاہ کی ان کو فکر نہیں ہے۔ ننھے ننھے بچے فاقہ کر لیتے ہیں۔ مگر ان کو کبوتر بازی سے فرصت نہیں ملتی ہے۔ حالانکہ ابھی پچھلے ہفتہ کی ہی بات ہے کہ آل یوپی ٹورنامنٹ میں مرزا یقین کو فرسٹ انعام ملا تھا۔ ان کے کبوتر سب سے اونچے اڑے تھے اور سب سے دیر میں واپس آئے تھے۔ جس کے نتیجہ میں ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے۔ درجنوں فوٹو کھینچے گئے، اور مبلغ ایک سو ایک روپیہ ایک پیسہ کا انعام ملا۔ اب اہلیہ کو یہ کون سمجھائے کہ آخر یہ رقم مرزا یقین نے اپنے بال بچوں ہی پر تو خرچ کی ہوگی اور مرزا صاحب کی اس نام وری سے کیا ان کے بچوں کا مستقبل نہیں روشن ہوگا؟

اسی طرح اہلیہ کو میرے ایک اور صاحب کرامت دوست صوفی عین الیقین سے محض اس لئے نفرت ہے کہ وہ جب بھی بیٹھتے ہیں سوائے ہوائیاں چھوڑنے کے

دوسرا کام نہیں کرتے ہیں، نہ نماز نہ روزہ! اگر بزرگی میں سب سے آگے اور ولایت کے تمام مراتب طے کیئے ہوئے، حالانکہ اہلیہ کو صوفی عین الیقین کی ولایت اور ان کی کرامت کا اسی سے یقین ہو جانا چاہیئے کہ ان کی ٹرِدسن کی مرغی صوفی صاحب کے تعویذ کی بدولت ہی ملی تھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ صوفی صاحب نے اپنے فرمانبردار جنوں کے ذریعہ منگوا کر خود ٹرِدسن کے حوالہ کیا تھا، مگر اہلیہ کی گمراہی دیکھیئے کہ صوفی صاحب کی اس زندہ کرامت کا وہ یہ کہہ کر مذاق اڑاتی ہیں کہ نعوذ باللہ یہ مرغی خود صوفی عین الیقین ہی چرالے گئے تھے جیسے چراغی وغیرہ کے نام سے لمبی رقم اینٹھنے کے بعد انھوں نے واپس کر دیا۔

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ اہلیہ کو میر صاحب سے بغض للّٰہی ہے اور وہ کسی طرح میر صاحب کے ساتھ کو میرے لئے پسند نہیں کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج صبح صبح جب میر صاحب نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا تو اہلیہ نے ان کی آمد کی خبر مجھے اس طرح دی، جیسے کئی دن کے مرے ہوئے کسی کتے کے سڑک پر پڑے ہونے کی اطلاع دے رہی ہوں، اور جب میں نے ان سے چائے بنا کر بھیجنے کو کہا تو جیسے وہ تلملا اٹھیں، قریب تھا کہ وہ ایٹمی دھماکہ کی صورت میں مجھ پر پھٹ پڑتیں کہ میں باہری کمرے کے دروازہ میں داخل ہو گیا، ناچار اہلیہ نے دو کپ چائے بنا کر باہری کمرہ میں بھیجی جسے دیکھ کر میر صاحب بڑی اپنائیت کے ساتھ بولے،... ارے بھئی کیا صبح صبح بھی خالی چائے ہی پلاؤ گے؟ میں نے کہا میر صاحب اس وقت جو کچھ مل جائے اسی پر صبر و شکر کیجئے، باقی دوسری قسط میں! جواباً میر صاحب نے ایسا پر تکلف قہقہہ لگایا کہ ان کے اوپر کے مصنوعی دانت نکل کر

چائے کی پیالی میں گر گئے جس نے نہ صرف انکے کپڑوں پر چائے کی کاریگری بنانے کا کام کیا۔ بلکہ ان کو پوری ایک کپ چائے سے بھی محروم کر دیا،

اہلیہ سے دوسری کپ چائے بنانے کی فرمائش کرنے کی جرأت کہاں سے لاتا، مجبوراً اپنے حصہ میں سے ہی میر صاحب کو بھی حصہ دینا پڑا، اور پھر باتوں کا سلسلہ چل پڑا،

دوران گفتگو میر صاحب کے اتنی صبح صبح نزول اجلال کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں فرمایا، ارے بھائی کہنا یہ تھا کہ میں آج سے جنتا پارٹی کا ورکر کرنے جارہا ہوں، تم کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا، اور دیکھو تم کو، تمہارے گھر کے تمام ووٹروں کو اور تمہارے تمام متعلقین کو جنتا پارٹی کے امیدوار کو ہی جتانا ہے کیونکہ کیونکہ ...... یہ کہتے کہتے انھوں نے اپنے ہاتھ میں دبی نوٹوں کی گڈی کی طرف اشارہ کر دیا۔

میر صاحب کی بات ختم ہوگئی وہ جانے کے لئے تیار ہوگئے، اور رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ پھر جنتا امیدواروں کو ہی کامیاب بنانے کی تلقین کی۔

اب میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی آخرکار میں نے پوچھ ہی لیا کہ ،، میر صاحب آپ تو کہتے تھے کہ قوم کا فیصلہ ہے کہ اس مرتبہ الکشن کا بائیکاٹ کرنا ہے اس لئے آپ سرگرم سیاست میں حصہ نہ لیں گے ؟؟۔

جواب میں میر صاحب نے مسکراتے ہوئے بس اتنا کہا کہ وہ تو ،، گیدڑ بھبکی ،، تھی۔

میر صاحب اتنا کہہ کر رخصت ہوگئے، اور میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میر صاحب واقعی عظیم سیاستداں ہیں۔ ....

یہ صدی کون سی ہے؟

اب تک یہ سنتا آیا تھا کہ ایک ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے اور ایک مہینہ ۴ ہفتوں کا ہوتا ہے، اور ایک سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے اور ایک صدی سو سال کی ہوتی ہے۔ مگر چودھویں صدی ہجری کے بارے میں پھندے میاں نے حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ ۹۹ سال پر ہی ختم ہو گئی، چنانچہ سنہ ۱۴۰۰ھ سے پندرھویں صدی کا آغاز ہو گیا۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں میاں کے اس حکم کو آنکھ بند کر کے بلکہ اپنی آنکھوں میں خود اپنے ہاتھوں سے دھول جھونک کر تسلیم کرتا ہوں، اور ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۰۰ھ سے پندرھویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے۔ کیونکہ میاں سے میرا بال سے زیادہ باریک اور شیشے سے زیادہ نازک رشتہ ہے۔ قارئین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میاں میرے پیر اور میں ان کا مرید ہوں، اور ایک مرید کا یہ آئینی اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ پیر کے حکم پر رات کو دن اور دن کو رات کہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو اسے اپنے کو مرید کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس رمز کی حکمت بالکل

صاف اور ظاہر ہے کہ دن کو دن اور رات کو رات تو سبھی کہہ دیتے ہیں، مگر مرید وہی ہے جو پیر کے حکم پر دن کے چمکتے سورج کو بھی خاطر میں نہ لاکر دن کو رات ہی کہے۔

مگر شیخ آفتاب ٹھہرے وکیل، وہ بھلا کیونکر بغیر جرح و بحث کیئے ہوئے میاں کے حکم پر آمنا و صدقنا کہتے، جبکہ وہ میاں کے مرید بھی نہیں ہیں، چنانچہ انھوں نے اعتراض جڑتے ہوئے کہا۔ اجی حضرت چودھویں صدی ہجری ۱۳۰۱ سنہ سے شروع ہوئی، اور سنہ ۱۳۹۹ تک اس صدی کے ۹۹ سال ہوئے، پھر یہ صدی کیسے ختم ہو گئی، جبکہ ابھی اس صدی کا پورا ایک سال ۱۴۰۰ھ باقی ہے

اعتراض اپنی جگہ پر کتنا ہی معقول ہو مگر وکیل صاحب کو تو یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ کس سے اعتراض کرنے جا رہے ہیں، بھیندے میاں سے مورچہ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے وکیل صاحب کے اعتراض کو ہوا میں اڑاتے ہوئے فرمایا، آپ کی اس بے وقت کی راگنی پر کوئی کان نہیں دھرے گا کیونکہ اس سال پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کا جشن ساری دنیا میں بڑے عظیم پیمانے پر منایا جا رہا ہے جس میں اسلامی ممالک بھی شامل ہیں خود بھارت سرکار نے بھی اس جشن کو بڑے پیمانے پر منانے کا اعلان کیا ہے پھر کیا تمام دنیا بے وقوف ہے اور آپ ہی عقلمند ہیں؟ اپنی عقل اور ہوشیاری میں بھی اس قدر غرور اچھا نہیں ہوتا، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ؎

بجا کہے جسے خلق خدا بجا سمجھو۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ شیخ آفتاب ایک وکیل ہیں، اور آج کے

ماحول میں وہی وکیل صحیح معنیٰ میں کامیاب ہے جو آخر دم تک لڑے جائے اور
کسی مرحلہ پر خاموش نہ ہو۔ چنانچہ شیخ جی نے کہا کہ میاں صاحب کا لرا اگر پورے
شہر میں پھیل جائے تب بھی آپ اس کو ختم کرنے کی تدبیریں کرتے رہیں گے
کسی بھی مرحلہ پر آپ اس کو عمدہ چیز سمجھ کر قبول نہ کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی
غلط بات ترویج پا رہی ہو تو آپ جیسے بزرگوں کا فرض ہے کہ آپ اسے رد کرنے
کی کوشش کریں۔ یا پھر آپ مجھے قائل کر دیں کہ ۱۴۰۰ھ ہی میں پندرھویں صدی
..... کیسے شروع ہو گئی؟ میاں صاحب وکیل صاحب کی اس اوٹ پٹانگ پر
واقعی جھلا گئے، اور بآواز بلند تجوید کی پوری رعایت کے ساتھ لاحول ولا
قوۃ الا باللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

مولوی فرقان جن کو ہم لوگ پیار میں مولوی ٹینو پال کہتے ہیں پہلے ہی
سے میاں صاحب کے اس فرمان کے خلاف برابر اعلانِ بغاوت کر رہے تھے
اگرچہ وہ وکیل صاحب کی طرح لمبی چوڑی دلیلیں نہیں پیش کرتے تھے مگر کہنا
ان کا بھی یہی تھا کہ یہ پندرھویں نہیں چودھویں صدی ہے۔ وکیل صاحب کی
وکالت نے جیسے ان کے سوکھے دھانوں پر پانی کا کام کیا۔ میاں صاحب کے
خاموش ہوتے ہی انھوں نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کیساتھ میری طرف دیکھا
جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھ لیا نا وکیل صاحب نے ثابت کر دیا کہ یہ پندرھویں
نہیں چودھویں صدی ہے

پھیندے میاں بڑے جلالی بزرگ ہیں ان کی عظمت کا حال کچھ اہل
دل ہی سمجھ سکتے ہیں (معاف کیجیے! یہ نہ سمجھیے گا کہ میاں صاحب کے بہانے

میں اپنی پبلسٹی کر رہا ہوں) ہمارے مولوی ٹینو پال ان کے کشف و کرامات سے بے خبر تھے چنانچہ ان کو جو کرنا تھا کر گذرے، مگر میاں صاحب پر کشف ہو گیا کہ ان کی نیت کیا ہے چنانچہ نہایت ہی جوش و جلال کے عالم میں ایسی عقل پھاڑ دلیل پندرھویں صدی کے ثبوت میں دی کہ مولوی ٹینو پال تو چاروں شانے چت ہو گئے، وکیل صاحب کو بھی دن میں تارے نظر آنے لگے۔

میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ بتایئے کہ اگر آپ کے پاس ۹۵-۹۶ ۹۹ پیسے ہوں تو کیا آپ انھیں روپیہ کہہ سکتے ہیں؟ مولوی ٹینو پال اور وکیل صاحب دونوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا کہ نہیں (کیونکہ ابھی انھیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنے بھیانک جال میں پھنسنے جا رہے ہیں) تب میاں صاحب نے فرمایا کہ جب پورے سو پیسے ہو جائیں گے تبھی آپ اسے روپیہ کہیں گے نا! مولوی ٹینو پال نے بڑے زور و شور کے ساتھ اپنے سر کو تائیدی انداز میں جھٹکے دئیے۔ جب میاں صاحب نے بطور مقدمہ اسے تسلیم کرا لیا تو پھر فرمایا کہ اسی طرح ۱۴۰۰ھ کا معاملہ ہے کہ جب ۱۴۰۰ ہجری پورا نہیں ہوا تو ۱۴۰۰ کیسے لکھا جا سکتا ہے گویا ۱۴۰۰ لکھا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ چودھویں صدی ختم ہو کر اب پندرھویں صدی شروع ہو گئی۔

میاں صاحب کی اس الہامی دلیل پر میاں صاحب کے تمام مریدین نے (جن میں میں بھی شامل تھا) دل کھول کر داد دی، ادھر مخالف کیمپ میں میاں صاحب کے علم کا ایسا رعب چھایا کہ وکیل صاحب اور مولوی ٹینو پال دونوں منھ پھاڑے کے پھاڑے رہ گئے۔

بات آئی گئی ہوگئی تھی، اور آئی گئی ہی جا رہتی، اور میاں صاحب کے علم و فضل کا جھنڈا بھی اسی طرح گڑا رہتا، مگر آج صبح ہی صبح مولوی ٹینو پال صاحب کئی اخباروں کا ایک بنڈل لے کر نمودار ہوئے، اور بلا تمہید فل اسپیڈ میں مجھ سے کہنا شروع کیا کہ دیکھو تم اور تمہارے میاں صاحب اور انکے چمچے چودھویں صدی کو پندرھویں صدی بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور حوالہ میں اسلامی ملکوں کو پیش کرتے ہیں کہ وہاں بھی پندرھویں صدی کے آغاز کا جشن منایا جا رہا ہے مگر بس یہ خبر سن کر کہ کوا کان لے گیا کوے کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے اور اپنے کان دیکھ نہیں لیتے، تف ہے تم لوگوں کی عقل و دانش پر! میں مولوی ٹینو پال کے تیور دیکھ کر سہم سا گیا اور پھر اپنے آپ کو بہت سنبھال کر کہا کہ معاملہ کیا ہے کچھ بتاؤ گے بھی یا یوں ہی لاف گزاف اڑائے جاؤ گے؟ اس پر انھوں نے ایک کے بعد دوسرا اخبار بنڈل سے کھولنا شروع کیا، اور ایک خاص خبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھ لو، جو ان میں سے ہر ایک اخبار میں موجود تھی، میں نے خبر کو غور سے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

"پندرھویں صدی کے آغاز پر اسلامی ممالک کی طرف سے ڈاک ٹکٹ جاری کئے جائیں گے جس کی منظوری مشترکہ طور پر تمام ممالک نے دیدی ہے، اور یہ ٹکٹ پندرھویں صدی کے آغاز پر یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ھ کو جاری کئے جائیں گے"

خبر بالکل صاف تھی جس سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ اسلامی ممالک نے یہ طے کیا ہے کہ پندرھویں صدی گویا یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ ہجری سے شروع

ہو گی۔ جب کہ میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ پندرھویں صدی شروع ہو چکی ہے
میں عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گیا، اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کہ
مولوی ٹینو پال کا منہ کس طرح بند کر دوں کہ اچانک مولوی صاحب موصوف پھر
نان اسٹاپ شروع ہو گئے کہ بات دراصل یہ ہے کہ تم نے اور تمہارے میاں
صاحب نے یہ سن لیا کہ اسلامی ممالک پندرھویں صدی کا جشن منانے کی تیاریاں
کر رہے ہیں، بس تم لوگ لگے پروپیگنڈہ کرنے کہ پندرھویں صدی شروع ہو
گئی ہے اور اس کے لئے لولی لنگڑی دلیلیں بھی تراشنے لگے، مگر یہ پتہ لگانے
کی کسی نے زحمت نہ کی کہ یہ جشن منایا کب جائے گا؟ اب اس خبر کو دیکھ کر تم
لوگوں کی آنکھیں کھل جانا چاہیئے۔

تم لوگوں کی اوٹ پٹانگ کا معاملہ تو یہ ہے کہ تمہارے میاں کے ایک
چمچے کو میں نے یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ پندرہویں صدی کا جشن اس لئے
منایا جا رہا ہے کہ چودھویں صدی کے بعد کسی وقت بھی قیامت آسکتی ہے
کیونکہ چودہویں صدی کے بعد کوئی اسلامی ہدایت موجود نہیں ہے، ساری
ہدایت کا تعلق چودہویں صدی کے آخر تک ہی ہے، معاذ اللہ تم معاذ اللہ۔ حالانکہ
ایسی کوئی بات نہیں ہے، نہ ہی کہیں اسلامی تعلیمات میں چودہویں صدی کا ذکر
ہے اور نہ ہی چودھویں صدی کے ختم ہونے کے بعد فوراً قیامت آنے کیطرف
کوئی اشارہ موجود ہے یہ جشن تو محض نئی صدی کے آغاز کا ہے، باز آجاؤ تم
لوگ ان بے ہودہ باتوں سے اور چھوڑ دو یہ خرافات! سمجھے میاں؟

مولوی ٹینو پال سے لاکھ میری بے تکلفی سہی اور میاں صاحب کے مقابلہ

میں ان کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی، مگر ان کی اس وقت کی گفتگو کچھ اتنی مدلل تھی کہ سوا خاموش رہ کر سننے کے میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔

یہ تو قارئین کو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ۱۴۰۰ھ میں پندرہویں صدی کا شروع ہو جانا کچھ میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا، مگر میاں صاحب کے فرمان پر ایمان لاتے ہوئے میں نے اپنے خیالات کو شیطانی وسوسہ قرار دے لیا تھا۔ اور بحکم حضرت پھیندے میاں اس صدی کو پندرہویں صدی ہی ماننے لگا تھا مگر مولوی ٹمیٹو پال کی اس تقریر نے مجھ کو کچھ اس قدر حواس باختہ کر دیا ہے کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں، اور اب صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی وقت تنہائی میں آنکھ بند کر کے سوچتا ہوں کہ نہیں میاں صاحب کا فرمان ہی بالکل درست ہے کہ چودھویں صدی ۱۳۹۹ھ پر ہی ختم ہو گئی اور ۱۴۰۰ھ سے پندرہویں صدی کا آغاز ہو گیا ہے، تو ایسا احساس ہوتا ہے کہ مولوی ٹمیٹو پال دیدے پھاڑے اور ہاتھ میں ڈنڈا لیے کہہ رہے ہوں، پھر وہی گمراہی! پڑتا ہے ابھی! میں گھبرا کر آنکھ کھول دیتا ہوں۔

تو اے قارئین! آپ مجھے اس کشمکش سے نجات دلائیے اور آپ ہی بتائیے کہ یہ صدی کون سی ہے۔ چودھویں ـــــ یا پندرھویں ؟؟

برادری کا جھگڑا

شفو میاں میں بھلا کمی بھی کیا تھی وہ چھ فٹ کے ایک خوبرو اور صحت مند سجیلے جوان تھے۔ قدرت نے انکو مردانہ حسن بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا، ساتھ ہی ان کا رکھ رکھاؤ اور بات چیت کا انداز ایسا تھا کہ ان سے ایک مرتبہ ملکر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی اجنبی سے بھی ملاقات کے وقت ان کے ہونٹوں پر جو لطیف سی مسکراہٹ ہوتی تھی وہ گویا اجنبیت کے احساس کو ختم کرنے کیلئے ہی ہوتی تھی۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہی شفو میاں اعلیٰ تعلیم کے حامل ایک انجینیر تھے اور حکومت کی ایک فیکٹری میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ایک سرکاری افسر! غرضیکہ ایک اچھے اور بہت اچھے لڑکے کی جن ماں باپ کو تلاش ہو شفو میاں میں ان کے سنہرے خوابوں کی حسین تعبیر بننے کی پوری صلاحیت تھی پھر بھلا ریاست حسین ادریسی صاحب کو اپنی بیٹی کے لئے اتنا مناسب رشتہ کیسے نہ پسند آتا شفو میاں تو ان کی پرواز کی آخری حد تھے، وہ تو اس سے کم کی بات بھی سوچ سکتے تھے۔

پرانے خیالات کے باوجود بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے ریاست

صاحب نے بھی اپنی بیٹی کو انگریزی تعلیم دلائی تھی، مگر انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد انھوں نے یہ کہہ کر تعلیم بند کرادی تھی کہ میری بیٹی کو ملازمت نہیں کرنا ہے اور ضروری تعلیم اس نے حاصل کر ہی لی ہے اب انھیں اپنی بیٹی کے لئے کسی مناسب رشتہ کی تلاش تھی جو قدرت نے ان کو گھر بیٹھے عطا کیا تھا۔ پھر بھلا وہ اسے کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ شفو میاں کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کر کے مزید اطمینان کر لینے کے بعد اس رشتہ کو قطعی اور آخری منظوری دینے سے قبل انھوں نے یہ معاملہ اپنی برادری کی میٹنگ میں بغرض منظوری رکھا، برادری کے ممبروں کے سوالات کے جواب میں ریاست صاحب نے بتایا کہ لڑکے کا اصلی نام محمد شفیع ہے، گھر کے لوگ دلار میں شفو میاں کے نام سے پکارتے ہیں، اور اسی نام سے وہ مشہور بھی ہو گیا ہے۔ چال چلن اطمینان بخش ہے، دین داری بھی اس قدر تو ہے ہی کہ نماز روزہ کا پابند ہے، ساتھ ہی اپنوں و بیگانوں میں ہر دلعزیز ہے، مگر برادری کے صدر صاحب نے جب یہ سوال کیا کہ لڑکا کس برادری سے تعلق رکھتا ہے تو ریاست صاحب کے چہرے پر فکر کی لکیریں نظر آنے لگیں، یہ سوال واقعی انتہائی ٹیڑھا تھا اور ریاست صاحب نے تمام معاملات کی جانکاری حاصل کر لینے کے باوجود اس کا پتہ نہیں لگایا تھا، چنانچہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ لڑکا کس برادری سے تعلق رکھتا ہے، صدر صاحب نے نہایت ہی کھرے لہجے میں کہا کہ جب یہی نہیں معلوم ہے تو آپ ہم لوگوں سے کس مسئلہ پر بات کرنے آئے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ انجمن ادریسیہ کے ایک ممبر ہیں اور آپ کے لئے یہ

لازم ہے کہ اپنی ہی برادری کے مفاد کے لئے بات کریں۔ اور اسی برادری میں رشتہ ناطہ جوڑیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مسلمان برادریوں کی دوسری تنظیمیں بھی کام کر رہی ہیں، مثلاً سامانی فیڈریشن۔ انجمن مکیریان، حلوائی برادری۔ انجمن سلمانیہ، جمعیۃ الراعین وغیرہ وغیرہ ان میں سے کئی کے اپنے اخبار بھی نکل رہے ہیں، جن کے ذریعہ اپنی اپنی برادریوں کی فلاح و بہبود کی بات کی جاتی ہے، اور ساری برادری کو منظم کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر برادری کے لوگ صرف اپنی برادری میں ہی رشتے کریں، اس لئے آپ پتہ لگائیے کہ شفو میاں کس برادری سے تعلق رکھتے ہیں، تاکہ آگے کے معاملہ پر غور کیا جا سکے۔

ریاست صاحب خدا جانے کیوں شفو میاں کے سلسلے میں برادری کا ..... پتہ لگانے کے حق میں نہیں تھے ان کا اپنا نجی خیال یہ تھا کہ جس لڑکے میں اتنی بہت ساری خوبیاں جمع ہوں، اس کے بارے میں یہ پتہ لگانے کا کوئی تک نہیں ہے کہ وہ کس برادری سے تعلق رکھتا ہے، مگر پھر بھی وہ ایک برادری کی تنظیم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور برادری کے کرتا دھرتا لوگوں کا حکم تھا کہ شفو میاں کی برادری کا پتہ لگایا جائے تب ہی بات آگے چل سکے گی۔ اس لئے بادل ناخواستہ ان کو اس کام کے لئے بھی تیار ہونا پڑا، لیکن اس سلسلے میں انھوں نے بجائے درمیانی لوگوں کے خود براہ راست شفو میاں سے بات کرنا ہی زیادہ مناسب سمجھا، اور شفو میاں سے ملاقات کر کے پہلے کچھ ادھر ادھر کی بات چیت کی اور پھر ان سے پوچھ ہی لیا کہ میاں صاحبزادے ذرا یہ تو بتاؤ

کہ تم کس برادری سے تعلق رکھتے ہو؟ جواب میں شفو میاں نے بڑی حیرت کے ساتھ کہا تعجب ہے کہ چچا میاں آپ کو اب تک میری برادری کا علم نہ ہو سکا میرا نام محمد شفیع ہے اور میرے والد کا نام محمد رفیع ہے! میں اسلامی برادری سے تعلق رکھتا ہوں۔

ریاست خاں شفو میاں کے اس جواب پر کچھ سٹپٹانے گئے، مگر اپنے کو سنبھال کر انھوں نے کہا کہ وہ تو صحیح ہے کہ تم ماشاء اللہ مسلمان ہو اور اسلامی برادری سے تعلق رکھتے ہو۔ مگر میرا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی کس برادری سے تعلق رکھتے ہو؟ جواباً شفو میاں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا کہ چچا میاں میرا خیال تو یہ ہے کہ تمام مسلمان صرف ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں جس کا نام ہے اسلامی برادری، اسی کی ہمارے مذہب نے بھی تعلیم دی ہے، اور اسی پر خود ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہے، چنانچہ جب مکہ کے مسلمان ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو حضور نے مکہ کے مسلمانوں کی مدینہ کے مسلمانوں کیساتھ برادری قائم کر دی، اور دونوں فریق اس پر مطمئن ہو گئے، حتیٰ کہ آپس میں رشتے ناطے ہونے لگے، اسی کا نام عربی زبان میں مواخاۃ ہے، اس لئے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی برادری کے بعد کسی اور برادری کا تصور کرنا اسلامی خیال نہیں ہے، بلکہ یہ ہندو دھرم کی نقل ہے کہ جس طرح انکے یہاں کائستھ بنیا، ٹھاکر، برہمن اور اچھوت وغیرہ کا تصور ہے، اسی طرح مسلمان بھی برادری بندی کریں۔ ظاہر ہیکہ اس ذہنیت سے مسلمانوں کو نقصان کے سوا فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا، کیونکہ برادری بندی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر آدمی اپنی برادری

کی ترقی کی ہی سوچے گا، اور ہر برادری والے کو بھی احساس ہوگا کہ ہماری برادری سب سے زیادہ افضل ہے اس سے برادرانہ عصبیت جنم لے گی، اور مسلمانوں میں اختلاف وانتشار کے نئے نئے دروازے کھلیں گے۔

چچا میاں ذرا سوچئے تو بھی کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں میں آپس میں یوں ہی کیا کم اختلافات ہیں، اور آپ یہ تو سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ان اختلافات کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ کوئی بھی اپنے کو کم سمجھنے اور قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہے پھر اگر اس برادری بندی کو فروغ ہو گیا، تو مزید کیسے کیسے فتنے جنم لیں گے۔ اس کے بارہ میں آپ ابھی سوچ بھی نہیں سکتے ہیں، اس لئے میں رشتہ اسی برادری میں کرونگا، جہاں اسلامی برادری کے بعد کسی دوسری برادری کا تصور نہ ہو، اگر آپ کو میری یہ شرط منظور ہو تو ٹھیک ہی ہے ورنہ آپ اپنی برادری میں ہی کوئی مناسب رشتہ پسند کر لیں۔

شفو میاں کی اس مدلل اور دو ٹوک گفتگو کے بعد ریاست صاحب عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئے، ایک طرف انکی برادری انجمن اور بیوی کا حکم کہ لڑکا اور تسبی ہی ہو، اور دوسری طرف شفو میاں کا یہ خالص اسلامی اور دو ٹوک خیال کہ اسلامی برادری کے بعد میں کسی بھی برادری کو قبول نہیں کر سکتا!۔

آخر کار ریاست صاحب نے طے کیا کہ اپنے چند مخلص اور قابل اعتماد دوستوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کریں، معلوم نہیں کیسے انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ان چند میں سے ایک آپ کا یہ میاں مردم شناس بھی ہے، چنانچہ انھوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں ہلتے کانپتے ہوئے پورا واقعہ میرے سامنے بیان کر دیا۔

اور پھر میری رائے کے طالب ہوئے کہ اس صورت حال میں ان کو کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔

ابتداءً تو میں نے ریاست صاحب سے کہا کہ شاید شفو میاں کسی "نیچ" قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لئے وہ اپنی برادری کو چھپا کر آپ سے گھیلے بازی کر رہے ہیں مگر جب ریاست صاحب نے بڑے پراعتماد لہجہ میں کہا کہ نہیں مجھے معلوم ہے کہ ان کی رشتہ داریاں شیوخ اور سادات گھرانوں میں بھی ہیں تو میں نے ان کی خدمت میں یہ مخلصانہ مشورہ پیش کیا تھا کہ اگر شفو میاں خود سے اپنی برادری نہیں ظاہر کرتے ہیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔ جب وہ ہر طرح فٹ ہیں، تو ان کو آپ خود "ادریسی" بنا لیجئے، اور شادی کارڈ پر محمد شفیع ادریسی ولد محمد رفیع ادریسی چھپوا دیجئے، بس کام بن جائے گا۔

مگر ریاست صاحب میرے اس مشورہ پر چراغ پا ہو گئے تھے، اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چل دیئے۔ کہ تم اتنے سنجیدہ مسئلہ میں بھی اپنی خرافات سے باز نہیں آتے ہو۔

پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم، ریاست صاحب نے اپنے کن کن دوستوں سے مشورہ کیا، اور انھوں نے کیا رائے دی۔ مجھے اس کی بھی خبر نہیں، البتہ اس گفتگو کے تین چار دن بعد ایک روزنامہ میں ریاست صاحب کا یہ بیان پڑھنے کو ضرور ملا کہ انھوں نے انجمن ادریسیہ کی بنیادی ممبری سے استعفیٰ دیدیا۔

اس کے بعد وہی ہوا، جو ہونا چاہیئے تھا، یعنی شفو میاں کی شادی، ریاست صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ ہو گئی، ریاست صاحب خوش

ہیں کہ ان کو بہت اچھا داماد مل گیا، شفو میاں خوش ہیں کہ انھوں نے ایک گھرانے کی بگڑی ہوئی ذہنیت کو سدھار کر اسلامی تعلیم کے مطابق کر دیا۔ اور میں؟ میں اس کے بعد سے برابر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایک ریاست صاحب کے گھر ہی تو نہیں تھا کہ چھٹی مل گئی، برادریاں، ان کی تنظیمیں اور ان کے اخبارات تو وبائی امراض کی طرح روز بروز بڑھ رہے ہیں پھر کیا اور بھی مسلم گھرانوں میں ریاست صاحب کے گھر والا مسئلہ نہیں پیدا ہوگا؟ اور کیا مسلمان اس طرح ایک دوسرے سے دور نہیں ہوتے جائیں گے۔

کاش برادری کے بجائے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے تنظیمیں قائم ہوتیں، اور "اپنے برادر" نہیں، بلکہ مسلم برادر کو اوپر اٹھانے کی بات سوچی جاتی۔!!

جاؤں کہ نہ جاؤں

قارئین البدر میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے یہ علم نہ ہو کہ مارچ ۸۰ء میں ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دار العلوم دیوبند کا ،،جشن صد سالہ،، منایا جا رہا ہے، ایڈیٹر البدر رسالہ وما عملیہ کے ساتھ اسی دار العلوم کے فاضل ہیں، (یعنی کہ ادارۂ البدر کے تقریباً تمام ہی اسٹاف ممبر فاضل دیوبند ہیں) اس لیئے میں بجا طور پر سمجھا تھا کہ اس پر مسرت موقع پر ایڈیٹر صاحب کی طرف سے دریا دلی کا مظاہرہ کیا جائیگا، اور ادارہ سے وابستہ تمام ہی لوگوں کو شرکت کی دعوت عام ہوگی، اور میزبانی کے فرائض اصولی طور پر ایڈیٹر صاحب بنفس نفیس خود انجام دیں گے۔ اس لیئے جب ایڈیٹر صاحب کے نام دعوت نامہ آگیا، اور انھوں نے اپنی روانگی کا قطعی پروگرام بنالیا تو فدوی میاں مردم شناس نے ایک عدد ملاقات خصوصی کرکے پہلے تو جشن دار العلوم کی اہمیت اور اس کے فضائل بیان کئے، اور اس کے بعد اپنی شرکت کو اس میں ناگزیر قرار دیتے ہوئے ان کے ساتھ ہی روانگی کی درخواست پیش کی۔ ہمارے ایڈیٹر صاحب کہنے کو تو بڑے پڑھے لکھے ہیں مگر اچھا ہٹائیے جانے دیجئے، مجھے معلوم ہے کہ ایڈیٹر چاہے جتنا بھی ....؟

ناکارہ ہو، قارئین ہر آڑے ترچھے موقع پر اسی کا ساتھ دیتے ہیں یہ ایک روایت ہے، جس کی اصلاح کی بیسویں صدی میں تو امید ہے نہیں!

بہرحال ایڈیٹر صاحب نے میرے عرض مدعا کے جواب میں مجھ سے دریافت کیا کہ تم وہاں جاکر کیا کروگے؟ مجھے اس سوال سے بڑی کوفت ہوئی، بھلا بتایئے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ عالمی پیمانے پر جو اجتماع ہو رہا ہو، جس میں ہزار ہا علماء و فضلاء کی شرکت کی امید ہو، جس میں عالم اسلام کی بھرپور رہنمائندگی کی توقع ہو اس روح پرور اجتماع میں شرکت کے خواہش مند کسی بھی شخص سے یہ پوچھنے کا کیا تک ہے کہ "تم وہاں جاکر کیا کروگے؟" میں نے جھنجھلاکر جواب دیا کہ جو آپ کے سوا تمام شرکاء کریں گے۔

ایڈیٹر صاحب بڑے موقع شناس آدمی ہیں سمجھ گئے کہ میں لڑنے پر بھی تیار ہو سکتا ہوں، اس لئے بات کا رخ پھیرنے کیلئے مسکرا دیئے، گویا مسکرا کر اپنے پچھلے سوال کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور پھر اسی مسکراہٹ کے دوران فرمایا، میرا مطلب یہ ہے کہ تم ایک ڈھلمل یقین یعنی کہ درمیانی قسم کے آدمی ہو، رافضیوں سے تمہارا یارانہ، رضاخانیوں سے تمہاری دوستی، قادیانیوں سے تمہارا ملنا جلنا، اور علمائے دیوبند کے یہاں تمہارا کھانا پینا، ایسی صورت میں تم اس قسم کے کسی اجتماع میں شرکت کس غرض سے کروگے، اور پھر اگر شرکت کروگے تو تمہارے دوسرے حلقہ ہائے احباب کے لوگوں کو کوئی شکایت تو نہ ہوگی؟ میں سمجھ گیا کہ ایڈیٹر صاحب خواہ مخواہ ٹانگ مارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس عظیم الشان اجتماع میں شریک نہ ہوں، حالانکہ میں پورے

وثوق کے ساتھ قارئین کو یقین دلا رہا ہوں کہ میری شرکت جشن کے لئے بالکل بے ضرر ہے چنانچہ میں بھی ایڈیٹر صاحب کے لحاظ و خیال کو بالائے طاق رکھ کر انکے پیچھے ہی پڑ گیا کہ یا تو مجھے شرکت کی اجازت مع ضیافت مرحمت کیجئے یا رکاوٹ کا سبب بیان کیجئے۔

میرے بار بار اصرار پر بالآخر ایڈیٹر صاحب بولے، کہ دیکھو بھائی تمہارے دماغ کی چولیں اپنی جگہ پر سے ہٹی ہوئی ہیں، اس لئے بعض وقت سیدھی بات بھی تمہارے بھیجے میں غلط ڈھنگ سے اترتی ہے معلوم نہیں تم وہاں جا کر کیا ہنگامہ برپا کر دو، اور کس قسم کے تاثرات لے کر واپس آؤ، اس لئے میں مناسب یہی سمجھتا ہوں کہ تم کو وہاں نہیں جانا چاہیئے، لہٰذا تم جشن میں شرکت کا خیال قطعی اپنے دل سے نکال دو۔ اور آئندہ اس سلسلہ میں میرا بھیجہ چاٹنے سے قطعی گریز کرو۔

ایڈیٹر صاحب تو اپنا آرڈر سنا کر گویا مطمئن ہو گئے، اور انھوں نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا کہ اب میرے جانے کا کوئی سوال نہیں ہے، مگر میرے دل سے شرکت کا داعیہ تو ختم نہیں ہوا تھا، بلکہ ایڈیٹر صاحب سے اس گفتگو کے بعد آتش شوق اور بھڑک گئی آخر کار میری سمجھ میں ایک تدبیر یہ آئی کہ اب مخالف کیمپ سے رابطہ قائم کیا جائے، آخر شرکت تو ان کو بھی کرنا ہی ہے، چنانچہ میں نے گھبرا کر رکھو چھ شریف کا سفر کر ڈالا جھوجھے میاں سے چونکہ پرانی دعا سلام تھی اور خیر سے میاں میرے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتے تھے، اس لئے سیدھے خانقاہ شریف کا رخ کیا، میرے پہنچنے کا وقت چونکہ "دنا وقت" تھا اور جھوجھے میاں اس وقت صرف مریدنیوں یا معتقدنیوں سے ملاقات فرمایا کرتے تھے، اس لئے

یں ،، مردانے میں رک گیا، دوپہر بعد جب میاں تشریف لائے تو ملاقات کا شرف حاصل کیا، میاں بڑے تپاک سے ملے، اور حاضری کا سبب دریافت کیا جس کے جواب میں، میں نے لکھنؤ سے رکھوچھہ شریف کے دوران رٹے ہوئے تمام جملوں کو مع تمہید دہراتے ہوئے عرض کیا، کہ ہر چند ہمارے ملک میں عربی مدارس کی بالکل کمی نہیں ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ ہندوستان عربی مدارس اور خانقاہوں کا ملک ہے۔ اور ہم کو کسی جشن میں شرکت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ہر دن ،،عرس پاک،، کے نام سے کہیں نہ کہیں جشن ہوتا ہی رہتا ہے اور کسی بھی جشن میں شرکت کر کے ،،فیوض وبرکات،، حاصل کیے جا سکتے ہیں اور ایک عربی مدرسہ کو ،،عربی یونیورسٹی،، کا نام دیکر جو تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا گیا ہے اس کے بعد کسی مدرسہ کہ ہمارا تعلق رہنا سراسر گمراہی ہے پھر بھی...... دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں شرکت کا تو آپ کا ارادہ بھی ہوگا ہی ؟ تو اسی لیئے حاضر ہوا ہوں کہ یہ سفر آپ کے ساتھ ہی ہو جائے تاکہ ،،مضر اثرات،، سے حفاظت کا بھی معقول بندوبست ہو جائے،

میری گفتگو کے دوران تو میاں پوری طرح خاموش رہے، البتہ ان کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے لیکن میرے خاموش ہوتے ہی انھوں نے نہایت برہمی کے ساتھ فرمایا کہ ،،اس وہابیوں اور نجدیوں کے مرکز سے ہمارا کیا واسطہ ہے کہ ہم اپنا دین وایمان خراب کرنے وہاں جائیں اور آپ نے یہ کیسے سوچا کہ میں وہاں شرکت کی بات بھی سوچ سکتا ہوں، مجھے تو آپ پر بھی کچھ شک ہو رہا ہے میں نے میاں کو اطمینان دلاتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت گھبرانے اور شک کرنے

کی کوئی بات نہیں ہے، اگر سیاسی مستقبل محفوظ کرنے اور الیکشن جیتنے کی خاطر وہابیوں سے مصافحہ کرنے سے نکاح ٹوٹنے کا اور وہابیوں کے داخلے سے مسجد دھونے کا حکم دینے والے وہابی امام کے پیچھے وہابیوں کے ساتھ صف میں شامل ہوکر نماز پڑھ سکتے ہیں تو کیا ہم کو اس کی بھی اجازت نہیں مل سکتی کہ ہم وہابیوں کے جشن میں شرکت کرلیں جب کہ سنا ہے کہ وہ جشن سیاست نہیں مذہب کے نام پر ہو رہا ہے اور مذہبی شخصیات کی ہی شرکت کی توقع ہے

چھوٹے میاں نے میری بات کا کوئی جواب تو نہیں دیا، البتہ غصہ میں آکر میرے "کٹر وہابی ہونے" کا اعلان کرتے ہوئے نان اسٹاپ انداز میں تمام قدیم تعلقات نظر انداز کر دیئے۔ اور بعجلت تمام "خانقاہ شریف" خالی کرنے کا حکم دیدیا، اور میں نہایت افسوس کے ساتھ بے نیل و مرام کچھوچھہ شریف سے واپس آگیا۔

گو کہ کچھوچھہ شریف کا سفر میں نے پوری رازداری کیساتھ کیا تھا مگر معلوم نہیں ایڈیٹر البدر کو کس جن نے میرے اس سفر کی ساری تفصیلات سے مطلع کر دیا چنانچہ واپسی پر میں جب پہلے دن دفتر البدر پہنچا تو منیجر صاحب نے بڑی تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ "آیئے آیئے مبارک ہو" کے طنزیہ جملوں سے استقبال کیا، ایڈیٹر صاحب کے بارے میں یہ معلوم ہونے پر کہ وہ باہر سفر پر گئے ہوئے ہیں قدرے اطمینان ہوا ہی تھا کہ منیجر صاحب نے یہ دھماکہ خیز انکشاف کیا کہ نہ صرف ایڈیٹر البدر بلکہ ان کے ذریعہ تمام متعلقہ لوگوں کو میرے کچھوچھہ شریف جانے اور وہاں سے واپس آنے کے سارے حالات معلوم ہو چکے ہیں، اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی میرے پیروں کے نیچے سے

زمین نکل گئی، اور میں نے اپنی جگہ پر یہ طے کر لیا کہ اب ادارۂ البدر میں میری ملازمت باقی رہنے کا کوئی سوال نہیں ہے، چنانچہ کسی کو بتائے بغیر اپنے خیال کے مطابق تھوڑی دیر کے بعد میں دفتر البدر سے وہاں موجود تمام لوگوں سے آخری مصافحہ کر کے چلا آیا، اور پھر اس کے بعد سے دفتر البدر نہیں گیا۔

تقریباً ایک ہفتہ گزرنے کے بعد اچانک ایک دن بازار میں ایڈیٹر صاحب پر نظر پڑ گئی۔ میں چپکے سے کھسک جانا چاہتا تھا کہ انھوں نے آواز دیکر بلا لیا۔

لیکن یہ کیا؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑیں گے، اور مجھ سے کہیں گے کہ ادارۂ البدر کو تمہارے جیسے ناکارہ لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب دیوبند کے قافلہ میں تمہارا نام بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اور تمہارا ریزرویشن بھی میں اپنے ساتھ ہی کرا لوں گا، تم مطمئن رہنا، اور پھر انھوں نے آئینہ کا تقاضا کرتے ہوئے کہا کہ فوراً لا کر دو، ورنہ رسالہ لیٹ ہو جائیگا۔ میں نے ان کے اصرار پر آج مع آئینہ دفتر البدر پہنچنے کا وعدہ کر لیا۔ ادھر کل شام کی ڈاک سے جھوجھے میاں کا معذرت نامہ وصول ہوا کہ میں اس جشن کی واقعی اہمیت نہ سمجھ سکا تھا، اس لئے پچھلی باتوں کو نظر انداز کر دو، اب میرا جشن میں شرکت کا قطعی پروگرام بن گیا ہے، اور تمہارا ساتھ میں رہنا ضروری ہے، اب میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہوں کہ میں جشن میں جاؤں کہ نہ جاؤں؟ اور جاؤں تو کس کے ساتھ، ایڈیٹر البدر کے ساتھ یا جھوجھے میاں کے؟

ایڈیٹر صاحب کو آئینہ دینا تو اس لئے ضروری ہے کہ میں ادارہ کا ملازم ہوں، اور ان کی طرف سے ملازمت سے جواب نہیں دیا گیا ہے، مگر دار العلوم

کے جشن کے سلسلے میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ میری شرکت ضروری ہے یا عدم شرکت، کیونکہ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ ایڈیٹر البدر کے مجھے ساتھ لے جانے کی منظوری دینے اور چھو چھے میاں کے جشن میں شرکت کا ارادہ کرنے میں بھی کہیں "وہابی امام" کے پیچھے نماز پڑھنے کی طرح کی کوئی سیاست تو نہیں ہے؟؟

مجھ سے ملئے

البدر کی ڈاک میں ہر مہینے کم از کم دس خط تو ایسے آتے ہیں جن میں راقم الحروف میاں مردم شناس سلمہ اللہ تعالیٰ کا جغرافیہ دریافت کیا جاتا ہے کوئی صاحب لکھتے ہیں اگر میاں مردم شناس کا اصلی نام کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر لڈن میاں، بھورے خاں، گھسیٹے کلو، پھیندے شاہ چھمن پیا اور بدنام شاہ اصلی نام ہو سکتے ہیں تو کیا میرے والدین اور خاندانی بزرگوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ میرا اصلی نام میاں مردم شناس رکھ دیتے ؟ یہ مذاق بھی خوب ہے کہ اصلی اور نقلی نام کا جھگڑا پیدا کر کے خواہ مخواہ پریشانی میں اپنے کو بھی ڈالا جائے۔ دوسرے کو بھی! اسی طرح بعض لوگ ایڈیٹر البدر کی تعریف میں خطوط ارسال کرتے ہیں کہ صاحب یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ میاں مردم شناس جو الٹی سیدھی باتیں آپ کے سلسلے میں لکھ دیتے ہیں، آپ اسے چھاپ بھی دیتے ہیں، بعض لوگ میری ذات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے میری تعلیم حسب نسب اور دیگر مشاغل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگوں نے

میاں مردم شناس سے ملنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔

بالآخر ایک دن جھنجھلا کر ایڈیٹر صاحب مجھ سے بولے کہ بھائی میں کس کس کو جواب دیتا رہوں، اور تمہاری خرافاتی شخصیت کا کس کس سے تعارف کراتا رہوں؟ کچھ تم ہی اس کا حل تجویز کرو۔ کہ لوگ مطمئن ہو کر صرف تمہاری نگارشات میں دل چسپی باقی رکھیں، اور تمہارے جغرافیہ سے دل چسپی ختم ہو جائے

میں نے عرض کیا کہ حضرت والا ایسا کیجئے کہ کسی مہینے کے شمارہ میں میرا ایک تعارف اپنے قلم سے لکھ کر شائع کر دیجئے۔ مناسب ہو تو میرا فوٹو بھی شائع کر دیجئے، لوگوں کو تسکین ہو جائے گی۔ ایڈیٹر صاحب نے میرا جواب سن کر مجھے کچھ اس انداز سے گھورا، جیسے اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ میرا دماغی توازن درست ہے یا نہیں، پھر ارشاد فرمایا کہ تمہاری سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ تم بات منہ سے نکالنے سے پہلے یہ نہیں سوچتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور کون بات کہنا مناسب ہے اور کون نامناسب!

اول تو میں، تمہارا تعارف کیا لکھوں کون سی ایسی بڑی خوبیاں تمہارے اندر بھری پڑی ہیں کہ جن کو بیان کروں، پھر البدر جیسے دینی و مذہبی رسالے میں تم فوٹو چھاپنے کی بات کر رہے ہو، کیا تم نے اسے کوئی اشتہاری یا کاروباری رسالہ سمجھ رکھا ہے؟

میں نے کہا، جناب والا جہاں تک تعارف کا سوال ہے تو وہ میں نے آپ ہی کی پریشانی حل کرنے کیلئے چھاپنے کو کہا ہے، ورنہ مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ میری طرف سے آپ کتنی خوش گمانی رکھتے ہیں، اور میرا تعارف آپ

کس انداز میں کرائیں گے، رہ گیا فوٹو چھاپنے کا معاملہ تو آخر بعض ناگزیر موقعوں پر فوٹو کھنچوانے کی اجازت ہے ہی۔ مثلاً پاسپورٹ کے لئے فوٹو کو آپ حضرات ہی جائز قرار دیتے ہیں، تو اگر قارئین البدر کو مطمئن کرنا بھی اسی قسم کی ناگزیر ضرورتوں میں سے ہو تو آپ فوٹو چھاپ دیجئے، ورنہ آپ نہ چھاپئے، کیونکہ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ فوٹو دیکھ کر قارئین کے دلوں سے میری وقعت کم ہی ہوگی بڑھے گی نہیں۔

ایڈیٹر صاحب بولے خیر یہ سب کچھ چھوڑو، بہتر یہ ہو کہ تم خود اپنا تعارف اپنے قلم سے کراؤ، اور اسے میں البدر میں چھاپ دوں، میں نے کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، میں بھلا اپنا تعارف کیا کرا سکتا ہوں، میں اگر اپنی کسی خوبی کا اظہار کر دوں گا تو قوم اسے انکساری پر محمول کیا جائیگا غرضیکہ صحیح صورت حال سامنے نہ آسکے گی۔ جواباً ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ نہیں تم اپنا تعارف لکھ کر لاؤ، اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہو گا ہی کہ یہ پتہ چل سکے گا کہ تم خود اپنے بارے میں کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کیونکہ تمہاری تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنے کو کچھ سمجھنے لگے ہو، اور اپنی اصل حقیقت بھولے جا رہے ہو۔

میں نے ایڈیٹر صاحب کی بات کو ہنس کر ٹال دیا اور اس وقت بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر ایڈیٹر صاحب نے حسب معمول تقاضہ کر کر کے ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ جب دیکھو یہی تعارف کا تقاضہ ہے۔ میں بھی گھبرا کر سوچنے لگا یا اللہ! میری بھی کوئی زندگی ہے کہ اپنا تعارف خود ہی لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ کچھ دن کے بعد ایڈیٹر صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنا کفن سی کر رکھ دو۔ تاکہ بعد میں زحمت نہ ہو،

میرے احتجاج کرنے پر وہ کہہ دیں گے کہ بات یہ ہے کہ تم جب سے ادارۂ البدر میں ملازم ہوئے ہو برابر موٹے ہوتے چلے جا رہے ہو میں چاہتا ہوں کہ تم خود اپنا کفن سی دو تاکہ آئندہ موٹاپے کے سلسلے میں تم کو احتیاط پر مجبور ہونا پڑے۔ مجھے مجبوراً ان کی بات ماننا ہی پڑے گی، کیونکہ وہ ایڈیٹر ہیں، اور میں ادارہ کا ایک ملازم۔!

تو اے قارئین! کافی سوچ بچار کرنے کے باوجود ایڈیٹر کے حکم سے سرتابی کے لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آسکی، مجبوراً میں آج کاغذ، قلم لے کر بیٹھا ہوں کہ اپنا تعارف لکھ ہی ڈالوں!

نام و نسب :۔ چونکہ تعارف کے لئے سب سے پہلے نام و نسب کا ذکر ضروری ہے اس لئے میں آپکو بتانا چاہتا ہوں کہ میرا نام میاں مردم شناس ہے، آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہی میرا نام ہے، آپ میرے کہنے سے اس پر یقین کر لیجئے اور سوچ سوچ کر اپنے دماغ کو کمزور نہ کیجئے، والد کا نام اور پھر انکے والد اور والد کے والد کے والد وغیرہ کا نام اس لئے نہیں لکھ سکتا ہوں، کہ والد صاحب نے اپنا نام استعمال کرنے کی ممانعت کی ہے۔ بصورت دیگر قانونی چارہ جوئی کا امکان ہے، میرے نسب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کچھ پشتوں کے بعد (جن کی تفصیل میں نہیں بتا سکتا ہوں، اگر کوئی صاحب بتا دیں تو شکر گزار ہونگا) حضرت آدم علیہ السلام سے مل جاتا ہے۔ جن کے نام نامی و اسم گرامی سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔

تعلیم :۔ واجبی سے کچھ زائد اور درمیانی سے کچھ کم، اعلیٰ سے اس لئے بھی زیادہ کم، البتہ ادنی سے کافی زائد اور جہالت سے کافی دور۔

مشغلہ !۔ البدر کے لئے آئینہ لکھنا، ایڈیٹر البدر کی ڈانٹ کھانا، اہلیہ سے تو تو میں میں کرنا، دوستوں سے دل لگی کرنا، دشمنوں سے نفرت کرنا، ایڈیٹر البدر کی جلی کٹی باتوں کا جواب سوچنا، اور منہ پر سب کچھ سن کر بھی خاموش رہنا !۔

ذریعۂ معاش !۔ ادارہ البدر کی ملازمت، ایڈیٹر البدر کی خوشامد، تعویذ گنڈے سوشل ورک اور حسب موقع سیاسی پارٹیوں سے رسم وفاداری کا اعلان۔

مذہب و مسلک !۔ مذہب اسلام ہے لیکن مسلک کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں، مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں، ایڈیٹر البدر کہتے ہیں کہ تم ڈھلمل یقین ہو، منیجر صاحب کا ارشاد ہے کہ ہمہ رنگ ہو، اہلیہ کہتی ہیں کہ آغا صاحب کی ناپاک دوستی نے رفض کے قریب کر دیا ہے صوفی چراغ علی کہتے ہیں کہ وہابی ہو، تعلقا شاہ کا فرمان ہے کہ نجدی ہو، مولوی ٹٹو پال کہتے ہیں کہ مزاری ہو اور خود میرا خیال یہ ہے کہ سوچ کر فیصلہ کروں گا۔

کارنامے !۔ شیخ پھیندے اور زلف دراز شاہ کے درمیان حق سجادہ نشینی کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ صرف میری ہی گواہی کی بنیاد پر شیخ پھیندے میاں کے حق میں فیصل ہوا تھا، حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح مرزا جمن، آغا صاحب اور چلبلے شاہ نے مل کر میری موجودگی میں شیخ پھیندے کو آمادہ کیا تھا کہ تم سجادہ نشینی کا دعویٰ کرو۔ گو کہ شیخ پھیندے کا کہنا تھا کہ اولاً تو وہ مزار ہی رجسٹرڈ نہیں ہے جس کی سجادگی کا جھگڑا ہے، پھر کسی درجہ میں اس کی مان ہو بھی گئی تو میرا کسی طرح حق نہیں ہے، مگر پنچوں کی اس رائے کے آگے شیخ پھیندے کو سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا کہ تم کو مقدمہ لڑنا ہی ہے، کیونکہ زلف دراز شاہ کا تعلق کیا معنی وہ تو اس

لائن کے آدمی ہی نہیں ہیں، پچھلے دنوں میونسپلٹی کی ملازمت سے رشوت خوری کے جرم میں وہ علٰحدہ کئے گئے ہیں، اس لئے انھوں نے اب یہ نیا ڈھونگ رچایا ہے، تم بہر حال "پرانے خادم" ہو، اور اب تمہاری سجادہ نشینی پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ہے شروع شروع میں تو میں نے اپنے آپ کو اس مقدمہ سے علٰحدہ ہی رکھا تھا، مگر بعد میں مرزا جمن کے اس انکشاف پر کہ آمدنی کے ۲۵ رفیصد حصہ پر شیخ پھیندے سے میرا سودا ہو گیا ہے تم گواہی دیدو۔ میں نے مرزا جمن کا منہ دیکھ کر گواہی دی، اور پھر وہی گواہی مقدمہ جتانے کا سبب بنی۔

دوسرا کارنامہ:۔ میں اپنا یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے ریاست حسین ادریسی صاحب کی صاحبزادی کی شادی محمد شفیع عرف شفو میاں سے کرا دی۔ جس کے ریاست صاحب دل و جان سے خواہش مند تھے، مگر "برادری" کا معاملہ پھنس جانے کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا، شفو میاں "برادری بندی" کے جھگڑے سے قطعی نفرت کرتے تھے، اور ریاست صاحب کے تو پورے نام ہی سے آپ ان کے خیالات کا اندازہ کر سکتے ہیں، بہر حال میں نے ریاست صاحب کو مذہب کی اطاعت اور "برادری" کی بغاوت پر آمادہ کر لیا، جس کے نتیجہ میں یہ شادی ہو گئی۔

تیسرا سب سے اہم کارنامہ جس کا ایڈیٹر البدر اور میری اہلیہ کے سوا ساری دنیا کو اعتراف ہے یہ ہے کہ میں نے البدر جیسے خشک اور علمی رسالہ کو مقبول عام کیا، ورنہ ایڈیٹر البدر کا "البدر" تو جیسا پسند کیا جاتا، مجھے معلوم ہے حالانکہ اس سلسلے میں ہم کو یقین ہے کہ اگر قارئین البدر کے درمیان ووٹنگ کرائی جائے تو ایڈیٹر صاحب کے مقابلہ میں مجھے ۲،۲ فی صد سے زیادہ ووٹ نہ مل سکیں گے

کیونکہ طاقتور کا ساتھ دینا دنیا کی عادت ہے، پھر بھی میں اپنے اس خیال پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور رہوں گا کہ "البدر" آئینہ کے بغیر ایسا ہی ہوگا جیسے چادر کے بغیر مزار۔!

مقام و مرتبہ:۔ لوگ ملتے ہوئے کتراتے ہیں، ایڈیٹر البدر دیکھ کر جھنجھلاتے ہیں، اہلیہ اپنی تقدیر کا گلہ کم اور صبر زیادہ کرتی ہیں، البتہ قارئین البدر کے بارے میں توقع ہے کہ آئینہ دیکھ کر مسکراتے ہونگے۔

مرنے کے بعد:۔ تعزیتی جلسے ہونے کی امید ہے ممکن ہے کہ مزار پاک پر عرس کا اہتمام بھی ہو، بہر حال اس حادثہ کو ایسا خلا تو ضرور ہی قرار دیا جائیگا جس کے پر ہونے کے ہر وقت امکانات ہوں۔

غالباً زندگی سے لے کر موت تک اپنے تعارف کا میں نے حق ادا کر دیا ہے پھر بھی اگر قارئین کو اطمینان نہ ہو تو وہ اپنی فہم کا قصور قرار دیکر ایڈیٹر البدر سے رابطہ نہ قائم کریں، وہ بھلا میرے بارے میں کیا بتائیں گے؟ ان کو مجھ سے بڑی ہمدردی ہی پڑی ہے۔!!

نویکا پرنٹنگ پریس نخاس لکھنؤ